

احمر جے پوری

(سوانح ، تبصرہ اور نمونہ کلام)

بِقَلْمَنْ
—
حافظ منظور احمد ادیب

مرتب
شاہد احمد جمالی

ناشر

ایجنسی ہمدرود دو اخانہ، ۳۱۲، رام گنج بازار، جے پور
فون: 2607012

﴿جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ﴾

نام کتاب	:	احمر جے پوری
نام مرتب	:	شادہ احمد جمالی
سن اشاعت	:	2012ء
تعداد اشاعت	:	500
اشاعت	:	بار اول
ضخامت	:	128 صفحات
سائز	:	20x30=16
طبعات	:	گلوبل کمپیوٹر سس ایند پرنٹر سس، رام گنج بازار، جے پور موبائل:- 9460866130, 9460257861
ناشر	:	ہمدرد دواخانہ ۳۱۲، رام گنج بازار، جے پور

ملنے کا پتہ

ایچ جی ایچ ڈی میڈیا دواخانہ ۳۱۲، رام گنج بازار، جے پور



تری شان بے نیازی میری ہم سفر ہے ورنہ
یہ مری شکستہ کشتی یہ ہوا مخالفانہ



جسے کمال سمجھتی ہے دانش حاضر
مری نگاہ میں اُحمر زوال آدم ہے



ایمان حق پہ جن کا زمانہ گواہ ہے
اُحمر جہاں میں ایسے بھی انساں ہوئے تو ہیں



نظر آتے ہیں سجدوں کے نشاں شاہوں کے ماتھے پر
وہاں شاہی بہ اندازِ گدائی ہے جہاں میں ہوں



زمانہ آج بھی شاہد ہے اُحمر اس حقیقت کا
مرتب ہے یہ بزمِ دو جہاں میرے فسانے سے

عرض ناشر

ایک مدت سے خواہش تھی کہ احمد صاحب مرحوم کی زندگی پر کوئی کتاب تیار کی جائے۔ میرے والد حافظ منظور صاحب کو بھی یہ تجویز پسند آئی تھی۔ میری گذارش پر انہوں نے ایک طویل مضمون جناب احمد پر لکھ دیا تھا جو کئی صفحات پر مشتمل تھا لیکن وقت اور حالات چونکہ انسان کے بس میں نہیں ہیں اس لیے تب یہ کام نہ ہو سکا۔ اب اللہ نے حالات کو سازگار بنایا کہ اس کام کو پورا کرنے کا موقع دیا ہے۔

چونکہ احمد صاحب مرحوم کی نشت ہمیشہ میرے تایارِ ضمی الدین رضا صاحب اور جمیل صاحب کے یہاں رہی ہے اور یہاں دیگر مشہور و معروف ہستیاں بھی روزانہ رونق افروز ہوتی تھیں جن میں چند نام جو مجھے یاد آ رہے ہیں وہ یہ ہیں:

جناب قمر واحدی، احمد بے پوری، شیمیم بے پوری، صلاح الدین عشقی، ستار بے پوری، ممتاز شکیب، خورشید احمد سحر، پیام، منظر، خداداد خاں مولیٰ، فرحت ایوبی، پارسا کوثری، حسین کوثری اور نہ جانے کوں کوں اُن کی فہرست بہت طویل ہے۔

ان سب حضرات کو ایک جگہ دیکھ کر مجھے اچھا لگتا تھا ایک دوسرے کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ اگر تنقید بھی ہوتی تھی تو ادب کے دائرے میں ہوا کرتی تھی۔ میں اس وقت آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ احمد صاحب کا سگار پینا مجھے اب بھی یاد ہے۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنا کرتے تھے، آواز بڑی دمدار تھی۔

اس کاوش کو میں اپنے والد حافظ منظور صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں اور ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ احمد صاحب مرحوم کی زندگی کے جو پہلوانوں نے اپنے مضامون میں اجاگر کیے ہیں یہ کام دوسرا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ وہ ایک طویل عرصے ساتھ رہ کر ان کے مزاج شناس بھی ہو گئے تھے۔

اس سے پہلے میں ”انتخاب کلام ناظم عزیزی“، طبع کراچکا ہوں۔ اس میں بھی میں نے یہ کوشش کی ہے کہ رضی الدین رضا صاحب کے طبع کرائے ہوئے ناظم صاحب کے دیوان ”عل و مذاب“ میں تحریر کلام سے ہٹ کر دوسرا کلام قارئین تک پہنچے۔ یہ دیوان اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہوا تھا۔ لیکن الحمد للہ میری یہ دونوں کتابیں میرے ذاتی مصارف سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان میں کسی سے بھی کسی بھی طرح کی مدد نہیں لی گئی ہے۔

بہر حال جتنا اہم کلام جناب احمد صاحب کا ہے اسی طرح

منظور ادیب صاحب مرحوم کے مضمون سے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ جو اردو ادب کے شاگقین اور تحقیقات کرنے والوں کے لیے ایک مثال ہے۔

میرا مقصد ان کتابوں سے منافع کمانا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی میرے بزرگوں نے ایسا کیا ہے۔ مقصد صرف اردو ادب کی خدمت ہے، میری دوسری کتابوں کی طرح (جو تقریباً باہمیں ہیں) یہ بھی شاگقین کے لیے مفت حاضر ہیں۔ انشاء اللہ اہل بے پور کو میری یہ کاوش ضرور پسند آئے گی۔

”نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ“
میری گزارش پر محترم جناب ڈاکٹر اظہار یزدانی صاحب نے ایک مکمل اور جامع مضمون احمد رجے پوری پر دیا ہے جس میں بڑی جرأت اور بے باکانہ انداز میں میں بڑی لطیف باتیں اُجاگر کی ہیں جو ہر ایک شخص نہیں کر سکتا۔

میرے خیال میں احمد مرحوم نے علامہ اقبال کے اس شعر کا پورا حق ادا کیا ہے۔

کر بُلْبُل و طاؤس کی تقلید سے تو بہ
بُلْبُل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

شاہد احمد جمالی

کلامِ احمد

نام رشید احمد۔ تخلص احمد۔ وطن بھے پور، راجستان
 وضع قطع اور چہرے بُشرے سے لکھا پڑھا انسان، پٹکارنگ،
 قدرے چھوٹا قد باوقار اور ٹھاٹ دار آدمی۔ شعر میں ڈوبا ہوا۔ دوستوں
 کا دوست، یاروں کا یار، متواضع، خلیق، ملنسار، با مرودت، خوش گفتار،
 خوش کردار، خوش لباس، کبھی سوت میں ملبوس، کبھی شیر و انی کی زینت،
 اداوں میں بانگلپن، نذر، جری، بے باک، انقلابی لیکن ایسا انقلابی نہیں
 جو سماج اور ملک و وطن کا باغی کہلائے۔ پرانے و فرسودہ خیالات کا باغی
 لیکن اچھی قدروں کا دلدادہ قدیم وجديد کے حسین امتزاج کو شعروں
 میں سمو نے والا، شاعری کے میدان میں اپنا جھنڈا سب سے اوپر
 رکھنے والا، عوام و خواص کا مقبول اور محبوب شاعر، مشاعروں کا بہترین
 ناظم، ماڈرن پوئیس سوسائٹی کا روح روایا احمد بھے پوری اپنی زندگی کی
 تقریباً باسٹھ منزليں طے کر کے چار نومبر ۱۹۴۸ء کو شام پانچ بجے اپنے
 حقیقی اور آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔

”اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا“

موت نے کس کو چھوڑا ہے۔ اس جسے پور میں مرزا مائل دہلوی سے احمد تک کیے کیے فنکار گوشہ گمنامی میں جاسوئے۔ احمد بھی ان میں سے ایک تھا۔ خدا اُس کی مغفرت کرے اور سو گواروں کو صبر کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔

عربی اور فارسی کی معقول تعلیم کے علاوہ احمد اُس زمانے کا میٹرک پاس تھا جب پرانی قدریں دم توڑ چکی تھیں اور نئی قدریں نہ صرف جنم لے چکی تھیں بلکہ پروان چڑھ چکی تھیں۔ احمد کو اول سے ہی فطری شاعری کے ساتھ درد، ترپ، سوز و گداز، نازک احساسات کا جو ہر عطا ہوا تھا۔

اول اول قبلہ مولوی حافظ محمد یوسف علی خان صاحب عزیز مدظلہ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے جن کے شاگردوں میں مرحوم قاضی امین الدین اثر عثمانی، منتی مظہر حسین صاحب، ناظم سنبلی، چودھری رفیق احمد خان صاحب عارف، سید یوسف علی صاحب، انجم، منتی عبدالرحمٰن صاحب، طالب اور فہیم الحسن شیم جے پوری نمایاں تھے۔ اور دوسرے مشہور و معروف شعراً احمد کے ہم عصر رہے ہیں۔ ان میں قاضی اثر عثمانی، ناظم سنبلی و طالب عزیزی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

عارف و ابھیم تقسیم وطن کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے، شیم
جے پوری ہندوستان میں جے پور کا نام روشن کر رہے ہیں اور غزلیہ
شاعری میں اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

قبلہ عزیز صاحب کے بعد احمد نے مولوی عبدالرؤف خان
صاحب، عاصم سے استفادہ کیا۔ حضرت عاصم نے اپنی بے پناہ
مصروفیات اور احمد کے ولولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے احمد کو حضرت میکش
اکبر آبادی کے سپرد کر دیا۔ جو ہندوستان کے گنے چنے اساتذہ اور صف
اول کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ احمد میں چونکہ بلا کی خود
اعتمادی تھی اور تمام شاعرانہ صلاحیتیں بروئے کار آچکی تھیں اس لیے
حضرت میکش اکبر آبادی نے کچھ عرصہ بعد ہی فارغ الاصلاح کر دیا۔

احمد کی شاعری کا نمایاں اور تابناک دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک متعین کیا جاسکتا ہے۔ یہ دور ہر اعتبار سے شاہکار دور ہے۔ اس
دور میں بہترین غزلیں اور فکر انگیز نظمیں تخلیق ہو کر منظر عام پر آئیں۔

احمد نے پچیس سال کے عرصہ میں ادبی دنیا کو کیسے کیے
شہپارے دیے یہ اہل جے پور اور دنیائے شعرو ادب سے پوشیدہ نہیں
۔ اس دور میں احمد ادبی دنیا پر چھائے رہے اور اپنی بہترین تخلیقات

سے عوام و خواص اور ادبی دُنیا کا دل جیت لیا۔ ادبی دُنیا میں اس وقت یہ بات پورے وثوق سے کہی جاتی تھی۔ جب پورے سے باہر کی ادبی دُنیا میں ہمارا نمائندہ احمد ہے صرف احمد۔

احمد مرحوم کے کلام کی کیا نمایاں خصوصیات ہیں اس کے متعلق کچھ عرض کرنا میرے نزدیک اس لیے بے سود ہے کہ احمد مجھ سے بہت قریب تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ ہو سکتا ہے کہیں طویل جذبہ رفاقت سے مغلوب ہو کر رائی کو پہاڑ بنانے کی کوشش کروں۔ یہ تو قارئین کو احمد کا کلام پڑھ کر ہی اندازہ ہو گا۔ یا پھر فقاد ان سخن کا کام ہے کہ وہ احمد کے کلام میں محاسن و معافیب تلاش کریں اور آزادانہ تبصرہ کریں کہ یہ انہیں کا حق ہے۔

زیر نظر مضمون میں صرف بحیثیت شاعر احمد کا تعارف مقصود ہے اور راقم السطور یہی فرض انجام دینے کی کوشش کرے گا۔ پچیس سال کے عرصہ میں احمد نے اتنا کچھ کہا تھا کہ وہ ایک مکمل دیوان کی شکل میں ہمارے سامنے آتا۔ لیکن اسے احمد کی بد نصیبی پر ہی محمول کیا جائے گا۔ کہ سن ۲۰۵۰ کے درمیان احمد کراچی چلے گئے تھے۔ تو اس خیال سے اپنا تمام کلام بھی اپنے ساتھ لے گئے کہ حضرت عاصم و دیگر احباب

سے انتخاب کرو اکر آئیں۔ لیکن بد قسمتی سے کراچی میں ان کا تمام سامان چوری ہو گیا اور وہ سب کچھ ہی چلا گیا جو شاعر کا اصلی سرمایہ تھا، اس حادثہ کا احمر پر بڑا اثر پڑا اور ایک عرصہ تک وہ اس صدمے کو برداشت کرتے رہے۔ نقلیں نہیں تھیں خود بد خط تھے۔ اکثر نیاز مند سے لکھوا لیتے۔ یا سید تقی حسین صاحب پیام سے۔ یا پھر مولانا رزی جیپوری کے لاکن و فائق فرزند پروفیسر الیاس عشقی ایم اے سے لکھوا تے اور رکھ لیتے۔

اب جوزیر نظر کلام ہے وہ زیادہ تر ان کے سبقتی جمیل احمد جمیل کی کوششوں کا نتیجہ ہے ورنہ عمر کے آخری حصے میں دماغی دوروں کی وجہ سے جو بچا کچا کلام تھا وہ بھی خرد برد ہو گیا۔ یادداشت بالکل جواب دے چکی تھی، ان کی غزل کا ایک مصرع کبھی میں پڑھ کر دریافت کرتا کہ احمر اس کا دوسرا مصرع کیا ہے تو کہتے بھئی مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ مسلسل دماغی دوروں کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ ایک مصرع ہی موزوں نہیں کر سکتے تھے۔ کئی سال اسی کیفیت میں گزرے اور اسی عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

احمر فن شعر میں ادب برائے زندگی کے سختی سے قائل تھے۔ ان کے کلام

میں جا بجا اس کا ثبوت ملتا ہے۔

مشی پریم چند مرحوم پر ایک نظم کی اُس میں اس عظیم فنکار کو
خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے خود کہتے ہیں:

کیا سمجھ سکتے ہیں تجھ کو عصر حاضر کے ادیب
کا کل ورخسار کی رنگینیں محفل کے نقیب
ان کے افسانوں کا نفس مدعا کچھ بھی نہیں
ایک لڑکا ایک لڑکی کے سوا کچھ بھی نہیں
ان کے کرداروں کا جزو خاص ہیں حسن و شباب
جھونپڑوں میں اُن کو آتے ہیں نظر محلوں کے خواب
اپنے گرد و پیش پر پڑتی نہیں ان کی نظر
مضھل انسانیت کی کچھ نہیں ان کو خبر
جس ادب کو زندگانی سے نہ ہو کچھ واسطہ
دوستو ایسے ادب سے ملک کو کیا فائدہ
مندرجہ بالا اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ احمد ادب کو زندگی
کی حقیقوں سے ہمکنار دیکھنا چاہتے ہیں۔ امر واقعہ ہے کہ سامنے کے
اس جدید اور ترقی یافتہ دور میں گل و بلبل، قمری شمشاد اور کاکل ورخسار

سے انسانی زندگی کو کیا مل سکتا ہے۔ حقیقتوں سے نظریں چڑا کر صرف تصورات کی دنیا میں کھوجانا انسانی زندگی اور با مقصد زندگی سے نہایت بھونڈ انداق ہے۔ یہی جذبہ ولگن، یہی احساس جگہ جگہ احمد کے کلام میں بکھرا ہوا ہے۔ احمد کی نظر چونکہ شاعر کی نظر ہے۔ اور شاعر کی نظر گردوپیش سے نہیں ہوتی۔ ہننا بھی نہ چاہیے۔ گردوپیش کے مشاہدے سے احمد کی غزلیں، نظمیں رنگیں ہیں۔ لہذا آئیے پہلے احمد کی غزلوں کو دیکھیں۔

غزل کے ہر میدان میں احمد اپنے ہم عصر شعراء میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ وہ روایتی شاعری سے ہٹ کر زندگی کی تلخیوں، آہوں اور آنسوؤں کو سامنے رکھتے ہیں۔ قمری و شمشاد کے فسانے نہیں سناتے بلکہ دار و رسن کی بات کرتے نظر آتے ہیں اور مقصدی شاعری سے صرف نظر نہیں کرتے۔ احمد کو اپنے ملک اور وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ اتنی محبت کہ وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ گنگ و جمن کے ساتھ کوئی نیل و فرات کا بھی ذکر کرے۔ وہ وطن اور ملک کا عاشق تھا اور ہمیشہ وطن اور ملک کے نغمے ہی سناتا رہا۔ اس کا ثبوت ملاحظہ کیجیے۔

ساؤ اپنے ہی دار و رسن کے افسانے
نہ شمع کی نہ کسی انجمن کی بات کرو

فرنگ و چین کے غم سے تمہیں ہے کیا مطلب
 تم اپنے ملک کی اپنے وطن کی بات کرو
 لطفتِ رخ و گیسو کی داستان کب تک
 اٹھو اب عظمتِ دار و رسن کی بات کرو
 بہت سنے ہیں فسانے اندر ہیری راتوں کے
 اب آفتاب کی پہلی کرن کی بات کرو
 ملک و وطن کی محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا مل سکتا کہ:
 ہے ذکر کیا یہاں نیل و فرات کا احرَر
 یہ ہند ہے یہاں گنگ و جمن کی بات کرو
 ”یا“

زگس و شمشاد سے کچھ کم نہیں خار وطن
 دیکھنے والوں کے حسن گلتاں ہیں سامنے
 خون اپنا بھی ہے احرَر صرف تزمین چجن
 داستان در داستان ہندوستان ہے سامنے

عشق وہ جذبہ ہے جو منزل تک رہنمائی کرتا ہے۔ عشق مجازی ہو یا حقیقی زندگی
 کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا ہے۔ اور عشق کے تمام مدارج اور مرحلوں سے

یوں واقف کرتا ہے۔

جو قدم قدم پہ محیط تھے وہ تمام اندھیرے مٹا دیئے
 مری رہنما رِ حیات میں یہ چراغ کس نے جلا دیئے
 بڑی احتیاط سے امتحان لئے میری ذوقِ نگاہ کے
 کبھی مجھ کو تابِ جمال دی کبھی ہوش میرے اڑا دیئے
 تجھے کیا کہوں میں اے چشمِ نم کیا تو نے مجھ پہ یہ کیا کرم
 تھے وہی تو جو ہر بے بہا جو چھلک کے تو نے لٹا دیئے
 ہیں اصولِ منزلِ عشق کیا مجھے اُمرِ اس کی خبر نہ تھی
 مگر اک نگاہِ جلال نے مجھے سب اصول سکھا دیئے

.....

اُمرِ کرہ ارض سے آسمان کی وسعتوں تک انسان کو باخبر، باعمل اور
 متحرک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پستی کی طرف مڑ کر دیکھنا ہی پسند نہیں کرتے۔
 وہ پیغام دیتے ہیں۔

اپنی وا ماندگی شوق میں پر پیدا کر
 ہو سکے تو کسی منزل میں گزر پیدا کر
 برق سے کھیل حوادث کے تھیڑوں سے نہ ڈر
 خوف بن کر دل باطل میں گزر پیدا کر

آخر اندریشہ پستی و بلندی سے گزر
انپی دنیا میں نئے شمس و قمر پیدا کر
ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔ احمد کی روشنی فکر انفرادیت
اپنائے ہوئے ہے۔

بادہ آشام بہت سے ہیں تھی جام ابھی
فیض ساقی کی نگاہوں کا نہیں عام ابھی
کیف سر مستی آغاز پہ ہنسنے والو
دیکھنی ہے تمہیں بے کافی انجام ابھی
کس سے سیکھوں میں رہ عشق میں آداب سفر
دور منزل سے ہیں یاراں سبک گام ابھی

.....

آحمد عشق کی پر خطر را ہوں سے گزرتے ہیں تو کہتے ہیں:
نگاہِ شوق کا حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں
جنونِ عشق کی منزل نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہوا کرے دلِ مضطرب حریفِ جلوہ طور
تری نگاہ کا حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں

اَحمر ماضی کی جانب نگاہ اٹھاتے ہیں تو یوں غزل سرا ہوتے ہیں:
 اے دوست ایک دن تھیں مرے اختیار میں
 یہ مستیاں جو کھیل رہی ہیں بہار میں
 جو کاروان شوق مرے ساتھ تھا کبھی
 کھویا ہوا ہوں اب میں اسی کے غبار میں
 اے کاش ہنسنے والے کبھی یہ بھی دیکھتے
 ہیں کتنے اشک چشم عروس بہار میں
 ماضی کا ذکر کرتے کرتے شاعر حال کی طرف لوٹتا ہے تو عشق اس کو
 اس منزل پر لے آتا ہے:

ہے ان کا دستِ ناز مرے دستِ شوق میں
 دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں
 میں انتہائے شوق میں حد سے گذر گیا
 اور اہل کاروان ہیں مرے انتظار میں
 اَحمر پکار اٹھیں وہ مجھے ہو کے بے قرار
 اتنا اثر تو ہو مرے دل کی پکار میں
 عشق کی رہنمائی میں شاعر جب اپنی منزل کے قریب پہوچتا ہے تو

پکارا گھتا ہے:

نہ کعبہ ہے نہ بخانہ نہ سجدہ ہے نہ سجادہ
 کے حاصل شعور جب سائی ہے جہاں میں ہوں
 نظر آتے ہیں سجدوں کے نشاں شاہوں کے ماتھے پر
 وہاں شاہی بانداز گدائی ہے جہاں میں ہوں
 نگاہِ غیر میں اُمر کہاں ہے ظرفِ نظارہ
 وہاں میری ہی نظروں کی رسائی ہے جہاں میں ہوں
 شاعر جو کچھ دیکھتا ہے اسی سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اپنے افکار ہم
 آپ تک پہونچاتا ہے۔ کبھی چونکا تا ہے کبھی جھنجھوڑتا ہے، کبھی ماحول کی
 عکاسی کرتا ہے۔ کبھی غیرت اور شرم دلاتا ہے کبھی آنے والے خطرات سے
 ہوشیار کرتا ہے۔ شاید ان اشعار میں یہی کیفیت نظر آئے۔

اپنی حالت پہ نہیں آئی ابھی نبضِ حیات
 آنے والا ہے ابھی اور بھی طوفان کوئی
 پوچھنے والا نہیں کوئی بھی پروانوں کا
 بزم ہستی میں نہیں شمع فروزاں کوئی
 خون کے چھینٹوں سے گلرگ ہے ہر دامِ بہار
 اہل گلشن میں نہیں صاحبِ عرفان کوئی

حالات اور ماحول سے اگر شاعر نگاہیں چرا لے تو یہ اس کی بد دیانتی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ملک اور قوم اور معاشرے کے تقاضوں سے جو ذمے داری شاعر پر عائد ہوتی ہے وہ اگر پوری نہ ہو تو یہ بھی شدید بد دیانتی ہے۔ احمد نے پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمے داری کا پورا حساس کیا ہے۔
ماحول کا جائزہ لے کر وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

نمایاں سوز غم کی لو ہے ہر اک آشیانے سے
نہیں فرصت زمانے میں کسی کو غم اٹھانے سے
فضا تبدیل ہوتی جا رہی ہے نظم گلشن کی
چمن محروم ہوتا جا رہا ہے مسکرانے سے
کہاں ہے اب زمانے میں وہ لطف خانہ ویرانی
کہ اب تو برق بھی گرتی ہے پچ کر آشیانے سے
برق و شر سے آنکھیں لڑانے والا احمد ایک حقیقت کی یوں
ترجمانی کرتا ہے:

زمانہ آج بھی شاہد ہے احمد اس حقیقت کا
مرتب ہے یہ بزم دو جہاں میرے فسانے سے
احمد عصر نو کے شاعر ہیں۔ انہوں نے فکر و نظر کو نئے زاویے دئے،

اور عصرِ نو کے مسائل کو نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ یوں کہتے ہیں:

نہ یہ بتکدے کی چوکھٹ نہ حرم کا آستانہ
مرے ذوق بندگی کا کہیں اور ہے ٹھکانہ
یہ حرم ہے یا شوالہ مجھے اس سے کیا کہ زاہد
مرا کام بندگی ہے نہ شعور آستانہ
میں ہوں عصرِ نو کا شاعر مری لئے نئی ہے احمد
ہے نئے ادب کا حامل مرا ذوقِ شاعرانہ

نئے ادب کا حامل اور عصرِ نو کا شاعر احمد اپنے ذوقِ شعر کو اس طرح
سنوارتا اور سجا تا ہے ملاحظہ کیجئے۔ احمد کافن پورے عروج پر ہے:

بھٹک نہ جائے کہیں کاروان فکر و نظر
چراغ اور جلاو کہ روشنی کم ہے
کے ساؤں میں داروں کے افسانے
مری نوائے انا الحق کا کون محرم ہے
اور اس غارہ اس مشاہدے کو دیکھیے جو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

جسے کمال سمجھتی ہے دانش حاضر
مری نگاہ میں احمد زوالی آدم ہے

کیا یہ حقیقت نہیں کہ دانش حاضر نے انسان کے لیے کیسی کیسی
چیزیں ایجاد کیں، سامنے کے کمالات بلاشبہ انسانی زندگی کے لیے سودمند
ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ جس انسان کے لیے یہ
عروج، یہ کمال ہے اور کارنا مے ہیں اس انسان کا اپنا کیا معیار رہ گیا ہے۔ کیا
اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور کے انسان میں صحیح اور تعمیری جذبہ
کس حد تک باقی رہ گیا ہے۔ انسان کے جذبات و احساسات، خیالات
و خواہشات اور کردار و عمل میں کس قدر پستی آچکی ہے۔ کیا ابن آدم اس سے
نگاہیں چرا سکتے ہیں۔ زوال انسانی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب سے متاثر
ہو کر شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

اہل جنوں نے چاند ستاروں کو جالیا
اہل خرد ہیں بحثِ عذاب و ثواب میں
جس کیف جس سرور کی مجھ کو تلاش ہے
وہ کیف وہ سرور کہاں ہے شراب میں
ظاہر ہے کہ یہاں شراب سے شراب ہی مراد نہیں ہے بلکہ
انسانیت ہے دم توڑتی ہوئی انسانیت ہے۔ ایسی انسانیت جس کا ظاہری
لباس بیٹھک انسانی ہے لیکن اس کے اندر خباشتوں کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ ایسی

ہی انسانیت کے لیے احمد ایک غزل میں یوں اشارہ کرتے ہیں اور جو کچھ مشاہدے میں آیا اُس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

تحا جن کا ہاتھ غارتِ گلشن میں ہم نفس
حیرت ہے آج وہ بھی ہیں اہل وفا کے ساتھ
ظرف و ضمیر وقت کے ہاتھوں میں پیچ کر
ہم بھی شریکِ بزم ہیں اہل خطا کے ساتھ
احمر حقیقوں پہ بھروسہ ہو کس طرح
جو ہوئے خدا بھی جبکہ ہیں سچے خدا کے ساتھ
یا

پردہ کیسا یہ نگاہوں کے مقابل سے اٹھا
اعتبارِ غمِ ہستی بھی مرے دل سے اٹھا
شکر ہے وقت کے شاعر کو ہے احساسِ خودی
بار پابندی افکار کا مشکل سے اٹھا
آج بھی رہن رہن و رہبر میں نہیں کوئی تمیز
امتیازِ ہوس و عشق نہ منزل سے اٹھا
آدمیت کی بنا جس میں ہوئی تھی قائم
آدمیت کا جنازہ اسی محفل سے اٹھا

انسانیت کا صحیح اور پاک جذبہ محبت ہی دے سکتا ہے نفرت نہیں،
محبت اور نفرت کی انسانی کشمکش سے شاعر جب الجھتا ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے۔

بھرے ہیں جن کے سینے نفرت و بعض وعداوت سے
اُنہیں اے ہم نفس کیا کام ہے جذبہ محبت سے
 بتائے گا وہ کیا راز درون پرداہ ہستی
 کہ جو انسان خود واقف نہیں اپنی حقیقت سے
 اسی کے ساتھ احرم یہ کہنا نہیں بھولتے ۔
 یہ کششی ہے یہ موجیں ہیں یہ طوفاں ہے وہ منزل ہے
 کھڑے کیا دیکھتے ہو دوستو ساحل کو حضرت سے
 ظلمتوں میں اگر کہیں سے روشنی کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو احراء کا
 استقبال کرتے ہیں ۔

تصویر صاف ہوگی نمودار عنقریب
 دُھنڈلے سے کچھ نقوش نمایاں ہوئے تو ہیں
 گلچیں کے دست بُرد سے فرصت ملی تو ہے
 غنچے بھی آج باغ میں خنداب ہوئے تو ہیں
 نفرت کی تیرگی میں محبت ہے ضوفگن
 تاریکیوں میں صبح کے امکاں ہوئے تو ہیں

ایک اور غزل کے کچھ شعر ملاحظہ کیجیے۔ شاید آپ کو احمد کے فن کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

نہ کسی دعا کی ہے جتنجو نہ کسی اثر کی تلاش ہے
جو کسی کے قلب کو جیت لے مجھے اُس نظر کی تلاش ہے
یہی عمر بھر کا ہے تجربہ یہی عمر بھی کی تلاش ہے
اُسے رہنوں کی کمی نہیں جسے رہبروں کی تلاش ہے
میں اسیرِ زلفِ مجاز ہوں تو حقیقوں کے فریب میں
تجھے اک خدا کی ہے جتنجو مجھے اک بشر کی تلاش ہے
مرا عجز میری سکندری مرا فقر میری شہنشہی
مجھے احمد ان سے غرض ہے کیا جنمیں بال و پر کی تلاش ہے
چھوٹی زمین کی یہ غزل جو آپ پڑھیں گے محض روایتی شاعری
نہیں بلکہ احمد نے اپنی انفرانیت کو نہیں کھویا ہے۔

حسن مصروف خود نمائی ہے
آئینے میں بہار آئی ہے
منزليں ہیں جنوں کی لامحدود
ہوش کی طور تک رسائی ہے

وقت ہستا ہے میری حالت پر
 شانِ رحمت تری دہائی ہے
 غزلیات کے نمونوں میں ایک اور غزل پیش کر کے غزل کا باب بند
 کر دوں گا۔ ان اشعار کا خالق تواب اس دنیا میں موجود نہیں لیکن یہ اشعار کبھی
 نہ میریں گے۔ احر کافن زندہ رہے گا، اس کی سرمستی، اُس کا جذبہ، اُس کی
 تڑپ، اس کی لگن، اُس کی امنگ قوس قزح کی طرح بہار کا پیام اور زندگی کی
 حقیقتیں پیش کرتی رہیں گی۔

غزل ملاحظہ ہو:

برق پھر دیکھ رہی ہے انہیں حیراں ہو کر
 وہ نشیمن کہ بے ہیں ابھی ویراں ہو کر
 زہد والوں کو بھی اعزاز وہ حاصل نہ ہوئے
 جو گنہگاروں نے پائے ہیں پیشماں ہو کر
 اور ہونگے جو لئے جا کے صنم خانوں میں
 ہم تو کعبے میں لئے صاحبِ ایماں ہو کر
 عمر بھر کشمکشِ شوق سے فرصت نہ ملی
 ہم جئے ہیں تو چراغِ تہہ داماں ہو کر

وہ بھی انساں ہے بھلا کیا کوئی انساں اُحمر
مات کھا جائے حوادث سے جوانساں ہو کر
غزل میں اُحمر کی روشن فکر سے آپ متعارف ہو چکے۔ اب آئیے
اُحمر کی چند نظموں کو دیکھیں۔

شاعری میں نظم ہی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں شاعر کھل کر
سب کچھ کہہ جاتا ہے۔ اُحمر کی نظموں میں جوش ہے۔ سرمستی ہے، سوز و گداز
ہے۔ درد ہے۔ تڑپ ہے، وہ اپنی نظموں میں طوفان کا مذاق اُڑاتا ہے اور
حوادث سے آنکھیں ملاتا ہے۔

”ہلال عید“ ایک ایسی نظم ہے جو ایک غریب فاقہ زده اور
محبور انسان کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعر اور پر سے کہتا ہوا آرہا ہے کہ عید کا چاند
نظر آتے ہی اہل ثروت اور کھاتے پیتے لوگ عید کی تیاریاں دھوم دھام سے
کرنے لگے۔ لیکن ایک ایسا بھی انسان تھا جس کے سامنے سب سے بڑا
سوال یہ تھا کہ صبح عید ہے اور جیب میں ایک پیسہ نہیں۔

غریب باپ کی معصوم بچی نے بازار سے چوڑیاں لانے کی فرماش
کی۔ لیکن محبور باپ بچی کو صرف پیار بھری باتوں سے ہی بہلا تارہا۔ بچی
چوڑیاں نہ پا کر زار و قطار رو نے لگی تو باپ کی آنکھوں سے بھی سیلا ب اشک

بہہ نکلا۔ اور اسی کے ساتھ شاعر کے جذبات میں بھی زلزلہ آگیا۔

پوچھ کر دامن سے آنسو گود میں اُس کو لیا
ہاتھ سر پر پھیر کر سینے سے پھر لپٹا لیا
دیکھ کر یہ بے کسی سینوں میں دل ہلنے لگا
ضبطِ غم کے حوصلے سب خاک میں ملنے لگے
اے ہلالِ عید ان کو کیا خوشی ہو عید کی
ٹھوکروں میں پورش پاتی ہو جن کی زندگی

شاعر اس ماحول میں غریبوں کو یوں ڈھارس بندھاتا ہے اور یوں زندہ رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔

اے غریبو، بے نواو اے رفیقو دوستو
بے کسی میں مسکراو خستہ حالی پہنسو
رحم دل اتنا نہیں ہے حکمرانِ روزگار
چیر دے جس کا کلیجہ آنسوؤں کی نرم دھار
احمر کی شاعرانہ خصوصیات اور اس کے دل کی تڑپ نے اس کو نذر
اور بے باک بنادیا ہے۔

احمر کو سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ لیکن جب وہ غریب اور
محصور عوام کو پتے دیکھتا تو سیاست کے بخیے اُدھیر کر رکھ دیتا۔ رہبرانِ قوم

کو ایسی ایسی سناتا کہ اُس کے دل کی بھڑاس بھی نکل جاتی۔ اور غریب عوام کے آنسو بھی خشک ہو جاتے۔

جے پور میں اوکڑائے ٹیکس ۵۳ میں لگا۔ عوام پر اچانک ایک بھاری بوجھ پڑ گیا۔ ایک عرصے تک اس ٹیکس کے خلاف ہنگامہ ہوتا رہا۔ کافی نقصانات ہوئے۔ احمد نے جو کچھ دیکھا اُس کو جرأت کے ساتھ یوں بیان کیا۔

خوف و دہشت کی خدائی ہے گلی کوچوں میں
بند بازار ہیں ماحول پہ چھایا ہے جمود
جو شغیرت سے ہیں بھڑ کے ہوئے لوگوں کے دماغ
پائی جاتی ہے ہر اک دل میں بغاوت کی نمود
لیڈران قوم کو شاعر یاد دلاتا ہے اور عوام کے جذبات کی ترجمانی
اس طرح کرتا ہے۔

ہم سے وعدہ یہ ایکشن میں کیا تھا تم نے
کام جتنا کی بھلائی کا کریں گے ہر دم
اور دیکھیں گے کوئی بات اگر اس کے خلاف
کر سیاں چھوڑ کے فوراً ہی چلے آئیں گے ہم

احمر عوام کا شاعر تھا۔ غریب عوام کا۔ محنت کشوں اور فاقہ مستوں کا
شاعر وہ غریبوں پر ظلم ہوتا کیسے دیکھ سکتا تھا۔

اپنے وعدے کی صداقت کو نبھانے کے لیے
ظلم سہنے کے لیے اور دباتے ہو ہمیں
کیا اسی واسطے کل دوٹ دیے تھے تم کو
آج بندوق کی گولی سے ڈراتے ہو ہمیں
یہ تند و تلخ لہجہ ملاحظہ کیجیے۔

کپڑا ملتا ہے پہننے کو نہ رہنے کو مکاں
زندگی کے لیے آرام کہاں سے لائیں
پیٹ بھرنے کو میسر نہیں ہوتی روٹی
ٹیکس دینے کو تمہیں دام کہاں سے لاائیں
احمر کی ایک نظم اور ہے جس کا عنوان ہے ”ان سے ملنے“ یہ ایک
تعارفی نظم ہے جس کے پانچ کردار ہیں۔ پہلا شاعر۔ دوسرا مولوی۔ تیسرا
لیڈر۔ چوتھا سرمایہ دار اور پانچواں غریب عوام۔ شاعر نے اپنے محبوب سے
یہ کہہ کر ان کا تعارف کرایا ہے۔

میری محبوبِ ادھر آئیں بتاؤں تجھ کو
روپِ اس دور کے انساں کا دکھاؤں تجھ کو
ہر کردار کے ساتھ یہ ٹیپ کا شعر نسلک ہے۔ تو آئیے آپ بھی ان
کرداروں سے ملنے۔

(۱) شاعر

آخر شاعر کے جذبات و احساسات کی بڑی قدر کرتا ہے۔ بڑی
مدح و ستائش کرتا ہے۔ اُس کو بعض فطرت کا ماہر اور ذریعوں کا روپ
ستاروں میں بد لئے والا تسلیم کرتا ہے اُردو کی تباہی پر شاعر کی بے چینی کو
دیکھتا ہے۔ لیکن شاعر جب خود اپنے معیار پر آتا ہے تو کیا وہ پورا تر تھا ہے۔
آخر کی زبان سے سنئے۔

بزمِ اردو جو کوئی آپ کو بلواتی ہے
تیرگی آپ کے احساس پہ چھا جاتی ہے
اس قدر کرتے ہیں یہ علم و ادب کی ذلت
پہلے چک لیتے ہیں اشعار کی اپنے قیمت
نوٹ سوسو کے کچھ جاتے ہیں جب جیب میں پانچ
تب کہیں شعلہ فشاں ہوتی ہے احساس کی آنچ

مولوی (۲)

مولوی صاحب قبلہ کے احترام میں آخر مطلق کوتا ہی نہیں کرتا اُنکی
ایسی ہی تعریف کرتا ہے جیسا کہ مولوی صاحب مستحق ہیں۔ لیکن جب عمل کا
میدان آتا ہے تو آخر کی تمام امید یہ مولوی صاحب سے منقطع ہو جاتی ہیں۔

واقعہ کرب و بلا کے یہ سناتے ہیں بہت
قوم کو خون کے آنسو یہ رُلاتے ہیں بہت
ان کو تاریخ میں ہے یاد فقط ذکرِ حسین
ذہن میں ان کے نہیں معركہ بدرو حنین
پیش کرتے نہیں اسلاف کے کردار کبھی
قوم کے ہاتھ میں دیتے نہیں تلوار کبھی
روحِ اسلام سے محروم ہے فطرت ان کی
ساری دُنیا سے نرالی ہے سیاست ان کی

لیڈر (۳)

مولوی صاحب کے بعد لیڈر کا نمبر آتا ہے۔ شاعر تفصیل سے کہتا ہوا
آرہا ہے کہ یہ وہ ہے جس کو تنہائی میں چین ملتا ہے نہ محفل میں۔ نہ دن میں نہ
رات کو۔ ہر وقت قوم کی خدمت میں مضطرب نظر آتا ہے۔ سارے زمانے کا دُکھ

در دا س کے دل میں ہے۔ اس بھلی میں لمبے چوڑے لکھر دیتا ہے لیکن یہ غریبوں کے نہیں سرمایہ داروں کے خوب کام آتا ہے۔ اگر کوئی مجرم سرمایہ دار قانون کے پنجے میں پھنس جائے تو یہ تڑپ جاتا ہے اور جب تک اُس کو قانون کے پنجے سے چھڑا نہیں لا تارا توں کی نیند یہ اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔ آگے احمد کی زبانی سنئے اور پھنس جائے اگر ایسے ہی پھندے میں غریب بھول کر بھی یہ کبھی جاتے نہیں اُس کے قریب کوئی مرتا ہے تو مر جائے بلا سے ان کی روح گھٹتی نہیں فریاد و بکا سے ان کی کام آتا ہے سفارش میں نوشته ان کا یعنی ارباب حکومت سے ہے ہے رشتہ ان کا سرمایہ دار۔ (۲)

اس کی یوں خبر لی جاتی ہے۔

خون مزدور کا پی پی کے گزر کرتے ہیں
عیش و عشرت سے زمانے میں بسر کرتے ہیں
یہ نہیں جانتے دنیا میں غریبی کیا ہے
مفلسی چیز ہے کیا؟ فاقہ نصیبی کیا ہے؟

منتخب جب کسی حلقة سے یہ ہو جاتے ہیں
 پاؤں پھیلا کے پھر آرام سے سو جاتے ہیں
 خوب کرتے ہیں بلیک اور مگن رہتے ہیں
 غم نہیں بھوکے اگر اہل وطن مرتے ہیں

غريب عوام (۵)

نظم کا آخری کردار غریب عوام ہیں۔ ان غریب عوام کے لیے ان
 کا شاعر اپنے دھڑ کتے دل میں کیسے جذبات رکھتا ہے اور کس طرح تعارف کا
 فرض انجام دیتا ہے ملاحظہ کیجیے۔

ان سے ملیے کہ برے حال ہیں برباد ہیں یہ
 میری دُنیا مرے ماحول کے افراد ہیں یہ
 گرچہ دُنیا کے نظر میں ہیں یہ بدحال غریب
 چشم بینائے مشیت میں ہیں لیکن یہ حبیب
 ان میں مزدور بھی ، فناکار بھی دہقان بھی ہیں
 ان میں عیسائی بھی ہندو بھی مسلمان بھی ہیں
 ان کی آمد سے ہیں بڑھ کر کہیں صرف ان کے
 فیضِ تعلیم سے محروم ہیں پچے ان کے

پیٹ بھر کر انہیں ملتی نہیں کھانے کو غذا
اور بیماری میں ملتی نہیں پینے کو دوا
جان گھٹ گھٹ کے یونہی تن سے نکل جاتی ہے
زندگی موت کی تلخی سے بدل جاتی ہے
احمر نے غریب عوام کو ان کے صحیح خدو خال کے ساتھ پیش کیا
ہے ان کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھا ہے اور آگے ان کی محنت کشی کا حق
یوں ادا کیا ہے۔

اہل دولت کے دلوں میں ہے جوانی ان سے
یعنی لو ہے کی کلوں میں ہے روائی ان سے
یہ اگر چاہیں تو طوفان سے لڑ سکتے ہیں
موت کے پنجہ خونیں سے اکڑ سکتے ہیں
جو شِغیرت سے بھڑک جائے اگر انکا دماغ
یہ بجا سکتے ہیں تہذیب و تمدن کے چراغ
اہل دولت کو بھی محتاج یہ کر سکتے ہیں
فرق شاہی کو بھی بے تاج یہ کر سکتے ہیں
لیکن افسوس کہ یہ بات نہیں جانتے یہ
رنج اس کا ہے کہ خود کو نہیں پہنچانتے یہ

رائم السطور نے بہت ہی احتیاط اور اختصار سے کام لیا ہے ورنہ نظم خاصی طویل ہے۔ آئیے ایک اور نظم سے آپ کو روشناس کروں یہ نظم جس کا عنوان ہے ”خوابِ احساس“، تقسیم وطن اور فسادات کا پس منظر پیش کرتی ہے۔ نظم کے دو کردار ہیں۔ ایک غریب دوسرا ایک امیرزادہ۔ دونوں ہم عمر ہیں۔ ایک جگہ پلے بڑھے پروان چڑھے، دونوں کا بچپن جوانی بڑھا پا، موت تک ساتھ رہا۔ غریب و امیر کا مقابل احر نے جس انداز سے کیا ہے وہ قابل تحسین ہے شاعری کے ساتھ احر نے حقیقت کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ پہلے چند شعر نظم کی تمہید کے طور ہیں۔

میں نے دیکھا کہ ہے یہ رنگ زمانہ کیسا
وفعتاً آگیا اک نیند کا میٹھا جھونکا
نیند آتی ہی رہی وقت گزرتا ہی رہا
خواب آتے ہی رہے اور میں سوتا ہی رہا
میں نے دیکھا رُخ تاریخ پہ چھایا ہے جلال
میں نے دیکھا کہ مرے ملک میں آیا ہے و بال
ذہن کے ساتھ خیالات میں ترمیم ہوئی
اک نئے دور نئے عہد کی تنظیم ہوئی

دشت کے روپ میں ہونے لگا تبدیل چمن
 تین افرنگ سے ہونے لگا تقسیم وطن
 لوگ ہونے لگے تقسیم کے غم سے رنجور
 نفرت و رنج سے مغلوب غصب سے مجبور
 پرورش پانے لگے دل میں جراشیمِ مفاد
 ہر طرف ہونے لگے ہندو مسلم میں فساد
 فسادات اور ہمارے اس بدنصیب ملک کے فسادات
 ہمارے ملک کے ماتھے پر ایک مستقل کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ اپنے آپ سے
 شرم آتی ہے۔ جب فسادات کی آندھی میں محل اور جھونپڑی ایک ساتھ
 اڑ جاتی ہے۔ لیکن محل کم اور جھونپڑی زیادہ۔ احرّ نے جو کچھ دیکھا وہی
 بیان کیا ہے۔

عصمتیں راہ میں لٹتے ہوئے دیکھیں میں نے
 غیرتیں شرم سے چھپتے ہوئی دیکھیں میں نے
 لغشیں بچوں کی تڑپتی ہوئی دیکھیں میں نے
 ماں میں بچوں کو ترسی ہوئی پائیں میں نے
 باپ بیٹوں کی محبت میں ترستے دیکھے

بھائی بہنوں کی جدائی میں تڑپتے دیکھے
 بیوی شوہر سے بچھڑتے ہوئے دیکھی میں نے
 مانگ موتی کی اُجڑتے ہوئے دیکھی میں نے
 ظلم انسان کے انسان کو سہتے دیکھا
 خون پانی کی طرح راہ میں بہتے دیکھا
 میں نے دیکھا کہ یہ ہے رنگ زمانہ کیسا
 دفتار آگیا اک نیند کا میٹھا جھونکا
 نیند آتی ہی رہی وقت گزرتا ہی گیا
 خواب آتے ہی رہے اور میں سوتا ہی رہا
 نظم کا انجام اسالمیہ پر ختم ہوا کہ انسانی درندگی کا دونوں ہی شکار
 ہو گئے، فسادات نے اگر غریب کو نشانہ بنایا تو سرمایہ دار کو بھی نہ چھوڑا اور
 دونوں ہی ایک ساتھ مارے گئے۔

ہمارے سماج میں مغربی ملکوں کی نقلی و باتی مرض کی طرح پھیلی
 اور اُس کی جڑیں اتنی گہری ہو گئیں کہ ان کا اکھاڑ پھینکنا قریب قریب ناممکن
 ہو گیا ہے۔ یہ برائی آج پورے معاشرے پر اپنادامن پھیلائے ہوئے ہیں۔
 ہماری ماڈل، بہنوں اور بیٹیوں کا آج سے ایک چوتھائی صدی پہلے جو رہن

سمن تھا وہ اب کہاں۔ احمد نے جدید تہذیب کے نام پر عربی اور بے حیائی کو دیکھا تو وہ تڑپ گیا اور اُس نے معاشرے کی اس ڈکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو ایک نظم ”حسن آوارہ“، تخلیق ہوئی۔ بے حیائی کے پردے میں احمد نے اس کی تہذیب اور جدید معاشرت پر شریفانہ احتجاج کیا۔ شاعر یہی کر سکتا ہے۔ بہکے اور بھٹکے را، ہی کو صحیح راستہ بتانا، ہی اُس کا کام ہے۔

آئیے نظم کے تیور ملاحظہ فرمائیے:

روپ میں انسانیت کے پیکر برق و شرار
جاری ہے اک حسینہ راہ میں مستانہ دار
بے حیائی سے دوپٹہ دوش پر ڈھلکا ہوا
بزم ناؤ نوش میں اک جام سا چھلکا ہوا
شرم کہتے ہیں کے اس لفظ سے واقف نہیں
تاکنے والوں کی نظروں سے ذرا خائف نہیں
شارع عام پر شاعر نے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کو جس عالم میں
دیکھا وہ اُسی کی زبان سے سنیے۔

تک رہی ہے مرد کی صورت کو لچائی ہوئی
شرم سے نسوانیت کی دل میں اُستائی ہوئی

ہر ادا آوارگی شوق کی غماز ہے
 فطرت گستاخ گویا مائل پرواز ہے
 دیکھ کر یہ بے حیائی شاہراہِ عام پر
 ہنس رہی ہیں غیرتیں بے غیرتی کے نام پر
 کشنہ تہذیبِ مغرب یہ ہماری بیٹیاں
 سینہ تہذیبِ مشرق پر ہیں ایک سنگ گراں
 پچھتی پھرتی ہیں راہوں میں بہ آوازِ دُبل
 باپ کی گڈی کا طرہ بھائی کی موچھوں کا بل

۱۵ اگست ۱۹۵۳ء یعنی آزادی کے پورے چھ سال بعد ایک
 نظم بعنوان ”جشن آزادی“ کہی گئی۔ احمد نے دیکھا کہ آزادی کے بعد
 بھی غریب اور پسمندہ طبقہ اور زیادہ غریب اور زیادہ پسمندہ ہوتا جا رہا
 ہے تو یوں شکوہ سخن ہوتا ہے۔

صرف محلوں میں ہے آزادی تباہ کی ضایاء
 چھونپڑوں میں ہے ابھی تک وہی مٹی کا دیا
 شکوے کیوں آج بھی گھر گھر میں ہیں ناداری کے
 لوگ ہیں کیوں آج بھی بیکاری کے

جبکہ عالم ہے وہی صحیح وہی شام وہی
 میکدھ ہے وہی ساقی ہے وہی جام وہی
 پھر یہ جتنا میں بپا شور قیامت کیوں ہے
 ہر طرف ملک میں افلاس و ہلاکت کیوں ہے
 ہم نشیں غم سے ترپتا ہے مرا قلب حزیں
 رنگ آزادی گلشن نہ بدل جائے کہیں
 لوگ فاقوں کی مصیبت سے نہ گھبرا جائیں
 شیشے پھر کی چٹانوں سے نہ ٹکرا جائیں
 میرا پیغام سنادو یہ بعنوان عمل
 اب بھی ہے وقت کہ اے وقت کی سرکار سننجل
 احمد نے زندگی کے ہر شعبے میں شاعر کی حیثیت سے اپنا فرض پورا
 کیا ہے اور اُس میں کہیں کوئی کوتا ہی نہیں کی ہے۔

”فاتحان ایورسٹ“، بھی احمد کی ایسی نظم ہے جو انسان کی
 لگن، جستجو اور سرگرمِ عمل رہنے کی معراج ہے۔ احمد نے ہمالہ کی چوٹی
 سر کرنے والوں کی بلائیں لی ہیں۔

مضنکھہ خوف و حوادث کا اڑاتے گزرے
 آنکھ آلام و مصائب سے لڑاتے گزرے

تند جھونکوں سے ہواں سے الجھنے گز رے
 اور پر پچ فضاوں میں سلجنے گز رے
 بڑھ کے جب آخری چوٹی پر رکھا تم نے قدم
 آگیا کوہ ہمالہ کو پیسہ اک دم
 تہلکہ مج گیا افلک کے ایوانوں میں
 ایسے انسان بھی ہیں آج کے انسانوں میں
 تم پر قربان نہ کیوں اہل جہاں ہو جائیں
 ناز کرتی ہیں تمہیں جن کے تمہاری مائیں
 ”جزل نجیب“ بھی ایسی ہی نظم ہے جس میں شاعر نے انسانی
 عزم کو سہارا دیا ہے اور ایشیاء کے بڑی طاقتوں کے چنگل سے نکلنے کی
 کوششوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی نظمیں ہیں۔ میں
 سمجھتا ہوں کہ اب مزید نمونے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے آخر میں چند
 قطعات ملاحظہ کیجیے وہی رنگ ہے، وہی سوز، وہی تڑپ۔

قطعہ

دل سینے میں جب شعلہ فشاں ہوتا ہے
 ہر سمت فضاوں میں دھواں ہوتا ہے

احساس پہ ہو جاتی ہے وحشت طاری
پھولوں پہ بھی کانٹوں کا گماں ہوتا ہے



پسینہ بن کے خون احساس کی رگ رگ سے رستا ہے
غروہ نفس زرداری کے انگاروں پہ سکتا ہے
وہاں پر ذکر ہی کیا ہے مقام آدمیت کا
جہاں پر آدمی چاندی کے چند سکوں میں بکتا ہے



مشہور قطعہ

زندگی کا پیام دے ساقی
امن کے صبح و شام دے ساقی
اب تو انساں نما درندوں کو
آدمیت کا جام دے ساقی
یاد حسین پر قطعہ

کوئی وقعت یہاں الفاظ و معانی کی نہیں
کوئی قیمت ہی یہاں طرفہ بیانی کی نہیں

یادِ حسین میں آنسو نہ بہا اے ناداں
یاں ضرورت ہے ترے خون کی پانی کی نہیں



رموزِ درد نہاں کوئی جانتا ہی نہیں
اصولِ ضبط فغاں کوئی جانتا ہی نہیں
کسی کے سامنے رونے سے فائدہ احر
جب آنسوؤں کی زبان کوئی جانتا ہی نہیں



احمرِ مرحوم کچھ ایسے نقوش چھوڑ گئے ہیں جو ادبی دنیا میں لازوال
رہیں گے، فنکار مرجاتا ہے مگر اس کا فن نہیں مرتا۔ فنی اعتبار سے بھی اور انسانی
حیثیت سے بھی فنکار اور انسان ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ احرِ مشاعروں کی جان
تھے۔ وہ مشاعرے کے ایسے نظم ہوتے تھے کہ یہ بات پھر کسی کو بھی نصیب
نہ ہو سکی۔ وہ دامے درمے قدمے سخنے شعروادب کی خدمت کیا کرتے تھے
لیکن انہوں نے شعروادب کو کبھی گرنے نہیں دیا۔ احرِ غیور اور خوددار انسان
تھے اپنے احباب میں وہ ایسے تھے جیسے انگلشتری میں نگ۔ ایک بار ایک شناسا
نے ہمیں سب کو اپنے صاحبزادے کی شادی کے دعوت نامے دیے۔ جس

میں دوسرے پروگراموں کے ساتھ دعوت ولیمہ بھی تھی۔ ساتھ ہی موصوف نے یہ خواہش کی کہ جناب اس خوشی کے موقع پر ایک مشاعرے کا بھی انتظام کیجیے اور اُس کو کامیاب بنائیے۔ بس پھر کیا تھا۔ احمد بگڑ گئے کہنے لگے جناب معاف کیجیے۔ آپ نے کیا ہمیں بھانڈیا قول سمجھا ہے۔ ایسا کوئی مشاعرہ نہیں ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شاعر آپ کے یہاں جا سکتا ہے۔ ہمیں آپ کے دعوت ناموں کی چند اس ضرورت نہیں ہے۔ براہ کرم یہ سب دعوت نامے واپس لیجیے اور مستحق لوگوں کو تقسیم کر دیجیے۔ وہ یچارے بڑے خفیف ہوئے۔ اُن کے اٹھ جانے کے بعد میں نے کہا یا راحمر تم نے بُرا کیا ایک وقت کی دعوت کھودی۔ اس پر ایک فرمائش قہقہہ پڑا اور احمد خود بھی ہنسنے لگے۔ اُس وقت شرکائے محفل میں مولانا رازی ہے پوری، مولانا ذہین شاہ صاحب، منشی صلاح الدین عشقی، قاضی امین الدین صاحب اثر، انجم عزیزی، شیم جے پوری، سالک عزیزی اور مہر نقوی موجود تھے۔ غرض مرحوم نے ادب کے نام پر کبھی کوئی سودا نہیں کیا۔

مشاعرہ پڑھواتے تو اُس کا خیال رکھتے کہ جو شاعر جس مقام کا ہے اُسی مقام پر پڑھواتے۔ اس باب میں احمد سے کبھی کسی کوشکایت کا موقع نہ ہو سکا۔ شاعری اور ترجم اس زمانے میں کچھ لازم و ملزم سے ہیں۔ وہ یہ کرتے کہ ایک شاعر ترجم والا بلاتے اور دوسرا تخت والا۔ اس

طرح مشاعرے سے سامعین کی دلچسپی برابر قائم رہتی۔ خواہ صحیح کے پانچ ہی کیوں نہ نجح جائیں۔

مشاعرے کو طویل ہوتا دیکھتے یا شاعر زیادہ ہوتے تو خود کو نظر انداز کر دیتے اگر زیادہ ہی اصرار کیا جاتا تو دو تین شعر پڑھ دیتے۔ ایسے نوجوان شعرا کو جن میں شعر کہنے کی واقعی صلاحیت ہوتی حوصلہ افزائی کرتے، مشاعرے میں اُس کو اس طرح داد دیتے کہ اُس کی کم تھیکتے۔ اس کا حوصلہ بڑھ جاتا اور وہ پورے اعتماد سے غزل پڑھتا۔ نوجوان شعرا کو تلقین کرتے کہ شعرا یسا کہو جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہو اور حالی کا یہ شعر پڑھتے۔

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پر حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

تو یہ تھے حضرت اُمر جے پوری
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

حافظ منظور احمد ادیب

نظمیہ شاعری کی فردوسِ مکشدہ

”احمر جے پوری“

ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی

معرفت برکاتی دو اخانہ،

۱۲۸ ابرام گنج بازار، جے پور ۲۰۲۰۰۳

غالباً ۸۳ یا ۸۴ کی بات ہے، کیفی عظمی مرحوم سے ایک انٹرویو کے دوران راقم السطور نے راجستان کے معاصر نظم گوشے شراء کے ضمن میں چند حضرات کی نمائندہ تخلیقات کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسند رجحانات خصوصاً موصوف کے اسلوبِ نگارش کی اضطراری درآمد اور غیر ارادی اثر آفرینی پر چند منٹ کی سمع خراشی کا ارتکاب کیا تھا۔ چونکہ پروگرام Live تھا اس لئے چند دیکھنے والوں نے اس کی تفصیلات والدِ مرحوم حضرت مولوی حکیم حافظ احمد مظہر الحق صاحب تبسم صائبی کے سامنے بیان کی (ہوں گی) بہر حال گھر لوٹنے پر قبلہ و کعبہ نے سخت ناراضگی کے ساتھ متذمثہ فرمایا.....

”میاں جس زمانے میں تم جیسے نو سکھیاۓ لوگ اردو شاعری میں نظم کی حقیقی عظمت و اہمیت سے واقف بھی

نہیں تھے اس وقت ہمارے احمد صاحب کا طویل
راجستان کی سرحدیں عبور کر کے ملک کے طول و عرض
میں بول رہا تھا۔ اردو کی نظمیہ شاعری سے متعلق تمہاری
معلومات احمد صاحب کے تذکرے کے بغیر نامکمل بھی
ہیں اور نامعتبر بھی۔

چونکہ احقر کی اردو فتحی اور ناپختتہ سی شعرگوئی کا پس منظر جے پور میں
جودھپور والے میاں صاحب کے عربیہ مشاعروں اور درگاہ خواجہ صاحب
رحمۃ اللہ علیہ اب جمیر کی صحبتوں کے علاوہ والد علیہ الرحمہ کی ذاتِ اقدس کے سوا
اور کچھ نہ تھا۔ لہذا یہ ڈانٹ پوری معنویت کے ساتھ اثر انداز ہوئی اور
اس طرح جے پور میں مشاعروں کی قدیم روایت کے باقاعدہ مطالعے نے
عبدالرشید صاحب احمد کی شاعرانہ عظمت اور راجستان کی شعری تاریخ میں
موصوفِ مکرم کی قیمتی حصہ داری سے واقف ہونے کا کما حقہ موقع فراہم کیا۔

زندگی کے روزمرہ کو حدود بیان میں منضبط و منظم کرنے کی جو
شروعات نظیراً کبراً بادی نے کی تھی وہ ابتداءً موضوعاتی دائروں میں ہچکوئے
کھاتی ہوئی دربارِ حالی میں پہنچ کر قدرے و سبع اختیال بھی ہوئی اور خوشحال بھی۔
اتنا ہی نہیں ”ادب برائے زندگی“ کی فرسودگی و عزلت پذیری سے آزاد ہو کر
اردو شاعری نے ”ادب برائے زندگی“ کی آزاد اور خود مختار فضاؤں میں کھل
کھیلا تو گویا نظم پر ہی بہار آگئی، آخر کوئی تو سبب ہو گا کہ تاریخِ انسانیت کی

Most Marshal قوم کی بیچارگی و خانہ ویرانی کا مرثیہ ہونے کے باوجود ”موجزِ اسلام“ آج بھی ایک زندہ و جاوید بیانیہ اور عظمت و شکوہ سے پُر ایک لازوال شاہکار قلم ہے..... پھر ”نالہ میتم“، ”حضر راہ“، اور ”شکوہ و جواب شکوہ“، جیسی بے نظیر اور بے مثال نظموں نے اس صنف کے بلند اقبال ہونے کی تاریخ مرتب کی۔ جوش کی گھن گرج اور دقيق مزا جی و قادر الکلامی نے بلاغت و فصاحت کے ادغام مرتب کے ساتھ نظم کو ”رمیہ شاعری“ کا مراد ف ہی بنا دیا۔ چنانچہ تب سے تاحال الفاظ متعارفہ کے مطابق دلوں کو گلدگانے اور جذبات کے تاروں پر مضراب گزار شاعری ”غزل“..... اور دماغ کو جھنخھوڑ کر گوں میں محمد بارود کو شعلہ رو کرنے والا کلام ”نظم“، ہی جانا جاتا ہے۔

جملہ مفترضہ کی گستاخی معاف! لیکن واقعہ یہی ہے کہ دلی کی بر بادی کا رو جنارو کر، گردشِ روزگار کی مرثیہ سرائی کے ساتھ راجپوتانہ میں قدیم شعراء کی آمد، رجوائز کی قصیدہ خوانی کا توارد اور ریاست کے مختلف حصوں خصوصاً جے پور میں فنکاروں کی زمینی جنت کے افسانے سنا کر Formal قسم کے تواریخی حوالوں کا اندرج نیز مختلف کانفرنسیز اور مشاعروں کی رپورتاژ اور وحید اللہ خاں، احترام الدین احمد شاعل، مولانا خندال ٹونکی، مفتون کوٹوی، پریم شنکر سری یو استو، کول جودھپوری اور متعدد اہلیان قلم کے Formal Data Collection کے علاوہ رقم السطور

کے ۸۰ کی دہائی میں سید امین الدین احمد صاحب کے ایماء و حکم پر کئے گئے Academic survey اور تجربات وغیرہ کا بکھان میرے نزدیک جگالی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہذا سید ھے سید ھے آدم برسِ موضوع.....:

احقر کی معلومات کے مطابق بیسویں صدی کے اویں عشرے میں جے پور کے شیخ رحمت اللہ مرحوم کے آنکن میں جنم لینے والے عبدالرشید احمد نے اپنے دور کی ضرورت کے مطابق تحصیل علم کے بعد (غالباً) پی ڈبلیوڈی کے محلے سے اپنے اوقاتِ مقررہ اور خدماتِ مخصوصہ کا لین دین کیا۔ لیکن فکر و احساس اور اظہار و بیان کی تمام سمتیوں کو اپنی ذاتی استطاعتوں اور عزتِ نفس کے خوددار تقاضوں کے ہی زیرِ کمان رکھا۔ کتنا حسین اتفاق ہے کہ جناب احمد نے جن ایام میں اپنی تخلیقی تسمیہ خوانی کا انعقاد کیا تقریباً اسی دور (۱۹۳۶ء) میں پیرس میں ”نجمن ترقی پسند مصنفوں“، کی بنیاد رکھی گئی اور برطانوی استعمار کی غلامی سے نجات دلانے کی جانبازِ مہم میں اردو کے شعرا و ادباء نے اپنی فعال و اجتہادی شرکتوں کا تاریخی فیصلہ لیا۔ تقریباً اسی طرز پر بننے والی جے پور کی ”مودران پوئٹ سوسائٹی“، کے سیکریٹری جناب احمد جے پوری نے ادبی تقریبات کی کامیاب نظمات کے ساتھ ساتھ ”اردو شاعری کی آبرو“..... کے مفروضے یعنی ”نیم وحشی صفتِ سخن“، کے مایا جال میں الجھے عوام و خواص کو عصری آگئی اور تلخ و شدید حقائق پر مبنی موضوعات کی نظمیں سنائے کر چونک اٹھنے پر مجبور کیا۔

نیند آتی ہی رہی وقت گزرتا ہی گیا
خواب آتے ہی رہے اور میں سوتا ہی رہا
ٹیپ کے اس شعر کے ساتھ ”خواب احساس“ کے عنوان سے کہی
گئی اس ماہی ناز تخلیقی کاوش میں بظاہر شاعر نے اپنے پاس پڑوں کے بے بس
اور مجبور انسانوں کی محرومیوں اور نا آسودگیوں کے بر عکس اپنی ذاتی بے حسی
اور مست خرامی والا پرواہی پرمیق خود اخسابانہ سرزنش کی ہے۔ لیکن درحقیقت
یہ ہمارے معاشرے کی دو انتہاؤں کی بے با کانہ اور جرأۃ مندانہ و یڈ یو گرافی
ہے جس کے ایک سرے پر محدود وسائل اور لا محدود وسائل سے دو چار سماج کا
اکثریتی مختکش طبقہ ہے تو دوسرے باوقار اور خوشنگوار کنارے پر زندگی کی
تمام تر سہولتوں کے سہل الحصول ذرائع (By Hook or Crook) سے مستفید و مستفیض ہونے کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے والے معدودے چند
حضرات کی بے غیرتی اور انسان دشمنی کے کریہہ مناظر اور ان دونوں انتہاؤں
کے نیچ شاعر حساس کا بیباک قلم اپنی فکری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے
کے جہد مسلسل میں مصروف و منہمک نظر آتا ہے۔ بلاشبہ یہ جناب احمد کی
نمایندہ نظم ہونے کے علاوہ اس دور کی شاندار تخلیق بھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

چند اشعار کا تاثراتی منظر نامہ

میں نے دیکھا مرے کاشانہ عشرت کے قریب
خون آلودہ پڑا ہے کوئی بیچارہ غریب

تلخی موت کا رخسار پہ چھایا ہے سکوت
 میں نے دیکھا کہ وہ ہے میری ہی اتنا کا سپوت
 میں نے سوچا کہ ہے یہ رنگ زمانہ کیا
 دفتاً آکے مری پیٹھ پہ اک تیر لگا
 زندگی موت کے طوفان سے ہم آغوش ہوئی
 شمع ہستی مری اک آن میں خاموش ہوئی
 جامِ احساس میں زہراب ٹپکتا ہی رہا
 لوریاں دیکے مجھے عیش تھپکتا ہی رہا
 نیند آتی ہی رہی وقت گذرتا ہی گیا
 خواب آتے ہی رہے اور میں سوتا ہی رہا

اندازہ لگائیے اس شخص کی حاسِ مزاجی اور احتساب پسندی کا جو
 اپنی آرام طلب اور عیشِ افزانیند کی حسین دیوی کی گدازو لذت نواز بانہوں
 میں استراحتِ نشین ہے لیکن اس عالم میں بھی اس کا ضمیر رشکِ بیداری بنا ہوا
 ہے۔ خلافتِ خلاقِ اکبر سے ممکن آدمی کی حالتِ زار پر شرمساری کا ادراک
 شاعرِ حساس کے دل پر کچو کے لگاتا ہے لیکن محسوس یوں ہوتا ہے جیسے پیٹھ میں
 خنجر گھونپا جا رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے علامتی شاعری کا سنه نزول ۱۹۶۷ء
 سے لیکن شاعر نے بہت پہلے (چالیس کی دہائی میں) ہی دنیا کی بے ثباتی

اپنوں کی بے تو جبی اور غیروں کے فقدانِ ہمدردی انساں جیسے منفی محركات کے لئے پیٹھ پر لگنے والے تیر کی علامت کا اتنا بمحل استعمال کیا ہے کہ بس تڑپ کر، ہی رہ جائے! شدتِ احساس اور انسانی ہمدردی میں دھڑکتے جذبوں کی ایک اور نمائندہ نظم ”غريب کي عيء“ ہے جو حسین منظر کشی کی آئینہ دار ہے۔ روایت ہلالِ عید کے ساتھ اہل ثروت کی جو خوشیاں شروع ہوتی ہیں ان کی نہ حد ہے نہ حساب، اس کے برعکس اس لمحہ مسرت سے ایک عمرت زده مزدور کی بیچارگی والا چارگی کی ابتدا ہوتی ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ظلم کو برملا ظلم کہنا شاعر کا فریضہ ہے۔

رحمِ دل اتنا نہیں ہے حکمرانِ روزگار
 چیر دے جس کا کیجھ آنسوؤں کی نرم دھار
 لیکن وہ جملہ مفلس و بے سروسامان لوگوں کے ساتھ اپنے حوصلوں
 اور ایمانی رجائے کو Share کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔
 اے غریبو! بے نواو! اے رفیقو! دوستو!
 بے بسی میں مسکراو خستہ حالی میں ہنسو!

میں اگر یہ عرض کروں تو بے جانہ ہو گا کہ جنابِ احمد کی یہ نظم اردو
 کے عظیم قلمکار مشی پریم چند کی نگارشات کے حقیقی پس منظر کو لا شعور کے نہاں
 خانوں سے ممکنات کے وسیع Canvas پر موجود کر دینے والی ہے۔ مزاج
 اور سوچ کی یہ ہم آہنگی ”مشی پریم چند“ نام کی نظم میں جنابِ احمد کے بھرپور

نذرانہ تحسین سے بھی مترشح ہوتی ہے۔ آج کا حیرت ناک المیہ یہ ہے کہ جس طرح بے ضمیر و کم ظرف احبابِ ادب کی کورنگاہی اور یتیم لفہمی احر مر حوم کی عظمت فکر کی منکر بندی رہی تقریباً اسی نیج پر متعصب اور ناعاقبت اندیش اربابِ اقتدار پر یہم چند کی نادر و نایاب اردو نگارشاتِ قلم سے آئندہ نسل کو محروم و ناشناس کر دینے کی سازش بھی متواتر رچ رہے ہیں۔ ”ٹیکس“ اور ”ملک کی آزادی و اتحاد میں ادیبوں کا حصہ“ بھی احر صاحب کی اسلوبی سعیات ہیں۔ اول الذکر میں جہاں اس دور کی تمام سماجی پسماندگی اور افلاس زده طبقے کی معاشی بدحالی کو پیش خیمه مان کر ٹیکس کو حکومتِ وقت کا جارحانہ اقدام قرار دیتے ہوئے آفاقی طور پر ایک لاپھل سوال کھڑا کیا گیا ہے۔

کپڑا ملتا ہے پہننے کو نہ رہنے کو مکاں
زندگی کے لئے آرام کہاں سے لائیں
پیٹ بھرنے کو میسر نہیں ہوتی روٹی
ٹیکس دینے کے لئے دام کہاں سے لاائیں
و ہیں آخر الذکر موضوع کے پردے میں اہمیانِ ثروت اور رہبرانِ
قوم کی، قلمکارانِ خلوص کی جانب سے کچ نگاہی و بے پرواہی کے مستقل
رویوں کو عمل نازیبا مانتے ہوئے شاعر نے تمام قلم کشانِ حزن و ملال کی
نمازندگی میں اپنا رِ عمل ظاہر کیا ہے۔

فکر فنکار نے آزادی کی ڈالی بنیاد
اس قلم ہی نے تو پیدا کئے نہرو آزاد
یہ نہ ہوتا تو یوں ہی رات بسر ہو جاتی
یعنی منزل کی تمنا میں سحر ہو جاتی

صرف یہ ہی نہیں کہ شاعر دنیاوی معاملات میں صرف قتوطیت کا
شکار رہا ہوا اور اس نے منفی حرکات کے تاثرات ہی قلمبند کئے ہوں بلکہ انسانی
عظمت و ہمت کے یادگار لمحوں سے بھی شاعر کا پورا پورا مس رہا ہے۔ اور اس
نے انسانیت کی عظمتوں کو بھی اپنے تخلیقی سفر کا رازدار اور ہم خیال بنایا ہے۔
بیسویں صدی کے عظیم واقعہ اور فاتحانِ ایوریسٹ تین سین اور بیلیری کے تینیں
جناب احمد نے اس طرح خراجِ محبت پیش کیا ہے۔

طنظنه جہد و عمل کا وہ دکھایا تم نے
کوہِ ایوریسٹ پہ لہرا دیا جھنڈا تم نے
بڑھ کے جب آخری چوٹی پہ رکھا اپنا قدم
آگیا کوہِ ہمالہ کو پسینہ ایک دم
تھہلکہ مج گیا اور اک کے ایوانوں میں
ایسے انسان بھی ہیں آج کے انسانوں میں
کر دیا غرق حوادث کا سفینہ تم نے
رکھ دیا چیر کے تقدیر کا سینہ تم نے

جس کو کل راز سمجھتا تھا زمانہ اُحر
 بن گیا آج وہی راز فسانہ اُحر
 میرے قلیل مطالعے میں عظمتِ ہمالہ کے تعلق سے
 علامہ اقبال کے ضرب المثل اور معروف جہاں شعر
 اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستان
 تیری پیشانی کو جھک کر چوتا ہے آسمان
 کے بعد ہمالہ کی بلندی کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اشرف
 الخلوقات کی عظمت کا رکن کے تابع کر دینے کی نادر تمثیل یہ شعر ہے
 بڑھ کے جب آخری چوٹی پر رکھا اپنا قدم
 آگیا کوہ ہمالہ کو پسینہ ایک دم
 جناب اُحر نے ”جشنِ آزادی“ اور ”اتحاد“ جیسے
 موضوعات پر بھی اس دور میں نظمیں کہی ہیں جب یہ موضوعات آج کی طرح
 محض رسمی نہ تھے بلکہ ہندوستانی سماج کے روز و شب کے لازمی حصے تھے۔
 عرش ہلتا ہے مشیت کو خبر ہوتی ہے
 یعنی اللہ کے بندوں پر نظر ہوتی ہے
 روشنیِ امن کی کرتی ہے فضا میں چھم چھم
 اتحاد آکے اڑاتا ہے ہوا میں پرچم

پھول کھلتے ہیں محبت کے چمن بنتے ہیں
تو میں بنتی ہیں زمانے میں وطن بنتے ہیں
(اتحاد)

اور ۷

آج آزاد ہوئے ہو گئے پورے چھ سال
لیکن اب تک بھی ہے چہروں پہ جمی گرد ملال
بستیاں بھوکی ہیں کیوں آج بھی انسانوں کی
کھیتیاں سوکھی ہیں کیوں آج بھی دہقانوں کی
آج کیا ملک میں برسات نہیں ہوتی ہے
دن نہیں ہوتا کہ اب رات نہیں ہوتی ہے
کیا وہ پہلا سا نہیں آج مشیت کا نظام
کیا بدل ڈالے ہیں قدرت نے اب اپنے احکام
لوگ فاقوں کی مصیبت سے نہ گھبرا جائیں
شیشے پتھر کی چٹانوں سے نہ ٹکرا جائیں
(جن آزادی)

یہ مختصر منظر تو آزادی کے اولین عشرے کا تھا پھر دیکھئے تقریباً ۲۵
برس بعد کا منظر یعنی آزاد ہندوستان کی بے راہ رو بلکہ گم کردہ راہ قوم کی سمت و
رفتار جس میں ویرانے کے درمیان سنسان و گمنام کھڑی سیکولرزم کی عظیم

یادگار، ایک بے یار و مددگار عبادت گاہ کو ہزاروں حیوال صفت، نام نہاد انسانوں کی ہوس و درندگی کا نشانہ بنائے بغلیں بجاتے ہوئے vthr ds منائے گئے، جانوروں، پرندوں کی حفاظت کے تحریک چلانے والوں اور اہنسا کے پچاری مہانتما گاندھی کے وطن میں سرکاری آئنک واد کی چھتر چھایا میں معصوم بچوں کو چیر کر آگ میں جھونکنا، نہیں منی دو شیز اؤں کی سرِ عام عصمت دری کر کے بھیمانہ قتل و غارت گری اور جائداد املاک کے جبریہ اتلاف بے حد کے علاوہ جمہوریت کے علمبردار قانون ساز ادارے کے سابقہ رکن (M.P.) کے قتل عمد کو جائز اور عوامی ردِ عمل کا شاخانہ قرار دیئے جانے پر ”گروانوت“، ہو کر اپنی وحشت و بربریت پر اتراتے پھرنا ”رashtriy مہانتا کا پرستیک“ بن گیا۔ جہاں ایک غیور اور محسنِ وطن طبقے کو محض اس وجہ سے نہ نئی آزمائشوں اور سختیوں میں بنتا کیا جا رہا ہو کہ وہ تعداد کے لحاظ سے ”جمہوری بھیڑ تنز“، میں قلیل ہیں۔ اس دورِ آزادی کو اگر احمد مرحوم دیکھ پاتے تو یقیناً خود دار و حساس فنکار یا تو خود کشی جیسے قبیحِ ردِ عمل کا شکار ہو جاتا یا پھر کسی نئے انقلاب کی داغ بیل پڑ جاتی۔ اس طرزِ تحریر پر احمد مرحوم کی زندہ و جاوید شاعرانہ شخصیت کے خدمت میں راقم السطور کی جانب سے ایک شعر بطورِ خراجِ اعتراف۔

خیر گردن کی نہیں زعم قیادت کی منا
میرے ہاتھوں میں قلم ہے ابھی تلوار نہیں

زیرِ مطالعہ انتخاب میں ایک نظم ایسی بھی ہے جو فی زمانہ اسلامی
 معاشرے کی ایک بڑی بے راہ روی کی نشاندہی کرتی ہے

روپ میں انسانیت کے پیکر برق و شرار
 جاری ہے ایک حسینہ راہ میں مستانہ وار
 شرم کہتے ہیں کے اس لفظ سے واقف نہیں
 تاکنے والوں کی نظرؤں سے ذرا خائف نہیں
 ہر ادا آوارگی شوق کی غماز ہے
 فطرتِ گستاخ گویا مائل پرواز ہے
 کشته تہذیبِ مغرب یہ ہماری بیٹیاں
 سینہ تہذیبِ مشرق پر ہیں اک سنگِ گراں
 بیچتی پھرتی ہیں راہوں میں با اندازِ دہل
 باپ کی گزری کا طرہ بھائی کی موچھوں کا بل

”حسن آوارہ“ کا درج بالا انتخاب صرف ایک غیرت مند
 معاشرے کے فرد کا احساس ہے۔ یہی احساس اگر ایمانی تقاضوں
 سے ہم آہنگ ہو کر خالقِ اکبر کے حکم اور محسنِ انسانیت کے اسوہ
 مقدسہ سے مربوط و متحضر ہو جاتا اور صرفِ نازک کے پردے کی شرعی
 حیثیت کا ادراک بھی بیدار ہوتا تو نظم (درج ذیل آن کے) گریز
 سے بھی یقیناً دو چار ہوتی۔

خوبصورت نازنیں ، زہرہ جبین و مہ لقا
کاش اپنی حیثیت سے بھی یہ ہوتی آشنا
کاش اپنی عظمت کردار کو پہچانتی
کاش اپنے منصب اعلیٰ کو بھی یہ جانتی
موسِ آدم یہی تھی، مادرِ عیسیٰ یہی
نصف بہتر بھی یہی تو تھی خلیل اللہ کی
یہ ابو بکرؓ و عمرؓ کی بیٹیوں کی شکل میں
تھی نبیؐ کی پاک طینت بیویوںؓ کی شکل میں
اسوہ خاتونِ جنتؓ جس کے حق میں رہنما
جس کی بخشش کی دعا فرمائے گئے ہیں مصطفیؐ
ہے تو یہ بیٹی وہی لیکن ذرا نادان ہے
دہر میں گم عافیت کی فکر سے انجان ہے
گر سمجھ جائے ، خدا کا ، حسن پر احسان ہے
حسن کا پردے میں رہنا حسن ہی کی شان ہے

(روحِ احمر سے معدرت کے ساتھ نذرِ ابو ذا گر بہ افکارِ احمر)

اپنی اس قلمی جسارت اور جرأتِ افہام و ترسیل کی ابتداء میں احتقر
نے قبلہ و کعبہ والد صاحب کی جس تنبیہ و سرزنش کا اعتراض کیا ہے اس
حادثے کے بعد جب بھی ناچیز کوئی تخلیق برائے ملاحظہ و منظوری و اصلاح

پیش کرتا تو یہ فرمان جاری ہوتا:

”میاں اللہ تمہیں ایمان پر ثابت قدم رہتے ہوئے
فکری و تخلیقی ارتقاء سے ہمکنار کرے، لیکن ہمارے احمر
صاحب کی نظم ”آپ سے ملنے“ تو احمر صاحب ہی کی
نظم ہے۔“

اور واقعہ یہ ہے کہ اس نظم کا تاثر ہر مرتبہ ایک نئے زاویے کے ساتھ
قلب و دماغ پر حاوی ہوتا ہے اور ہر بار احساس کی نئی را ہیں واہو کر تخلیق کار
کی عظمت بیان اور ندرتِ خیال کی پے در پے منزلیں پار کرتی ہوئی مسلسل
روای دواں ہوتی ہیں یعنی سامع و قاری اپنے قرب و جوار میں وہ سب کچھ
تلائش کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اشارے
شاعرِ مرحوم نے اس زندہ وجاوید تخلیقی شہ پارے میں پیش کر دئے۔۔۔ جوش
بلیح آبادی کی شاعرانہ عظمت پر فراق گورکھوری نے اپنی زندگی کی طویل ترین،
دقیق ترین اور عظیم ترین نشری کاؤش ”اعتراف ہوش بر بیان جوش“ میں ایک
جملہ فرمایا ہے:

”کوئی شاعر تمام عمر میں صرف ایک واحد زبان زد عام
شعر کہنے میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً وہ عظیم شاعر ہے۔۔۔
پھر اس پڑھان پچنے تو پیدا ہونے سے مر نے تک
پوری زندگی زبان درازی اور بیان نوازی کی پے در

پے منزلیں طے کی ہیں اس لئے اس کی عظمتوں کا
احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو امرِ محال ضرور ہے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ جس نادر المثال شہ پارے نے رقم الحروف کو تحریر تاثر میں مسحور و مرعوب رہ کر (اپنی بے بضاعتی اور عدم استعداد کے باوجود جود) قلم برداشتہ جسارتِ حرف زاری کے لئے متحرک کیا وہ اس دور کی وہی معرکۃ الآراء نظم ہے جو آج بھی اپنے تمام حرکات اور پس منظروں و پیش منظروں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ زندہ وجاوید ہے بلکہ Long Fellow کی مجوزہ تعریف کے مطابق اس کسوٹی کی بھی مراد ف ہے:

”کسی حساس اور باشعور تخلیقی مزاج کا جذبہ بصورت اظہار مترشح ہو کر صرف اس کے تشخص ہی کو وقار و استحکام نہیں بخشتا بلکہ عصری ادب کی ترجیحات و توجیہات کو سیراب کرتا ہوا ایک ایسے بحرِ فیضان و تاثر کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو تاحد امکاں (Upto Infinity) نسل در نسل (Source of inspiration) بنارہنے کا متحمل ہو۔“

چنانچہ نظم ”آپ سے ملنے“، مرحوم صدی کے وسط میں ہندوستانی معاشرے کی ایک مکمل اور مدل تصویر کشی ہے۔ میں تو متجاوزِ اوقات ہو کر فہم و ادراک کی اس وادیٰ پر خار میں تخيیل گشت

کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جہاں ”مسدس حالی“ کا وسیع اور تجرباتی کینو اس ملت مبین حق نصیب کے عاقبت نا اندریش ارباب حل و عقد کی فنا فی الد ہر قوت فکر و عمل اور بے حسی طلب خیر سے مشتق ہو کر کسپری اور لا چارگی کا پیش خیمه بنانا ہوا ہے۔ انہیں نامساعد حالات کو ایک سلیقہ مندانہ Flash back کے بطور استعمال کرتے ہوئے سماج کے چند اہم اور نمائندہ افراد کی Proxy کے ساتھ پذیرائی فکر اور عظمت بیان کا مرقع نذرِ قرطاس کیا گیا ہے۔ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ جنابِ احمر جے پوری نے اپنی فکری اور منصبی حیات کے بعد المشرقین میں توازن قائم رکھتے ہوئے ”زیست کردن“ پر عمل در آمد کیا، چنانچہ مذکورہ تخلیق کے اولین کردار کے طور پر شاعر نے تفاوت ظاہر و باطن کو تقابی خاکہ بنانے کا پیش کیا ہے۔

میری محبوب ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو
روپ اس دور کے انساں کا دکھاؤں تجھ کو

آپ سے ملتے کہ ہیں آپ ہمارے شاعر
نبضِ فطرت کا سمجھتے ہیں جو خود کو ماہر

حال اردو کی تباہی کا جو سن پاتے ہیں
فرطِ احساسِ الہم سے یہ تڑپ جاتے ہیں

لیکن۔

نوٹ سوسو کے پہنچ جاتے ہیں جب جب میں پانچ
تب کہیں شعلہ فشاں ہوتی ہے احساس کی آنچ
اپنے آپ سے نگاہیں ہٹاتے ہی شاعر کا تجسس سماج کے جس
نمائنڈ پر مرکوز ہوتا ہے وہ حقیقتاً بھی مسلم معاشرے کا فرد مخصوص ہے یعنی
وہ شخص جو خود دنیا و آخرت کی تمام سچائیوں سے واقف اور صراطِ مستقیم کی حقیقی
رہبری کا مکلف سمجھا جاتا ہے۔

آپ سے ملتے کہ ایک مولوی صاحب ہیں آپ
دین میں سرورِ کونین^۲ کے نائب ہیں آپ
وعظ بھی کہتے ہیں تقریر بھی فرماتے ہیں
پھول ابلاغ و فصاحت کے بھی برساتے ہیں

لیکن۔

ان کو تاریخ میں ہے یاد فقط ذکرِ حسین^۳
ذہن میں ان کے نہیں معزکہ بدر و حنین
روحِ اسلام سے محروم ہے فطرت ان کی
ساری دنیا سے نزالی ہے سیاست ان کی
دنیا کا عظیم ترین جمہوری ملک ہونے کے ناطے ہمارے یہاں
سیاسی قائد کی بڑی شان و عزت سمجھی جاتی ہے لیکن شاعر نے یہاں بھی دھستی

رگوں کو نہایت چاک دستی سے چھووا ہے ۔

آپ سے ملتے کہ ہیں آپ ہمارے لیڈر
قوم و ملت کی تباہی سے ہیں ہر دم مضطرب
سارے صوبے میں مسلم ہے سیاست ان کی
قدرتی ہے اسمبلی میں حکومت ان کی
لیکن ۔

جب بھی پھنس جاتا ہے الجھن میں کہیں کوئی غریب
بھول کر بھی نہیں جاتے یہ کبھی اس کے قریب

دورِ حاضر میں ارباب سیاست اور اہلیانِ ثروت ایک دوسرے
کے لئے لازم و ملزم ہو گئے ہیں لیکن شاعر نے پچاس سال قبل کا نقشہ اس
طرح کھینچا ہے کہ ہندی کا قدیم مقولہ ”جہاں نہ پہنچے روی وہیں جا پہنچے کوئی“،
آج بھی صادق آرہا ہے۔ دیکھئے۔

آپ سے ملتے کہ ایک صاحبِ دولت ہیں آپ
لائق فخر ہیں اور قابلِ عزت ہیں آپ

میں کئی آپ کے ہیں ملک میں جاری ہر سو
دبدبہ آپ کی دولت کا ہے طاری ہر سو

لیکن ۔

منتخب جب کسی حلقة سے یہ ہو جاتے ہیں
پاؤں پھیلا کے بس آرام سے سو جاتے ہیں

خوب کرتے ہیں بلیک اور مگن رہتے ہیں
 غم نہیں بھوکے اگر اہل وطن رہتے ہیں
 اور آخر میں اس عظیم شخصیت کی کردارگشی کی گئی ہے جو
 ہندوستانی سماج کا بھی حقیقی نمائندہ ہے اور انسانیت کی فی زمانہ حقیقی عکس
 ریزی کا مکلف بھی یعنی بے چارہ محنت کش ۔

ان سے ملنے کے برے حال ہیں بر باد ہیں یہ
 میری دنیا مرے ماحول کے افراد ہیں یہ
 گرچہ دنیا کی نظر میں ہیں یہ بدحال غریب

چشمِ بینائے مشیت میں ہیں لیکن یہ حبیب
 ان میں مزدور بھی فنا کار بھی ، دہقان بھی ہیں

ان میں عیسائی بھی ، ہندو بھی ، مسلمان بھی ہیں

ان کی آمد سے ہیں بڑھ کر کہیں صرف ان کے
 فیضِ تعلیم سے محروم ہیں بچے ان کے

پیٹ بھر کر انہیں ملتی نہیں کھانے کو غذا
اور بیماری میں ملتی نہیں پینے کو دوا
جان گھٹ گھٹ کے یوں ہی تن سے نکل جاتی ہے
زندگی موت کی تیلخی میں بدل جاتی ہے

لیکن۔

یہ ہری چیک کے موزے، یہ سیہ کاف کے بوٹ
یہ بلیورنگ کی ساڑی یہ گرے سلک کے سوت

یہ چمکدار درتچے یہ فلک بوس مکان
یہ طرب خیز باغچے یہ ہری گھاس کے لان

جلوہ آراء ہے ہر اک بزم انہیں کے دم سے
سارے ہنگامے ہیں سرگرم انہیں کے دم سے

اہل دولت کے دلوں میں ہے جوانی ان سے
یعنی لو ہے کی کلوں میں ہے روائی ان سے

یہ اگر چاہیں تو طوفان سے لڑ سکتے ہیں
موت کے پنجہ خونیں سے اکڑ سکتے ہیں

جو شِ غیرت سے بھڑک جائے اگر ان کا دماغ
یہ بجھا سکتے ہیں تہذیب و تمدن کے چراغ

اہل دولت کو بھی محتاج یہ کر سکتے ہیں
فرق شاہی کو بھی بے تاج یہ کر سکتے ہیں

لیکن افسوس کہ یہ بات نہیں جانتے یہ
رنج اس کا ہے کہ خود کو نہیں پہچانتے یہ

میری محبوب ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو
روپ اس دور کے انساں کا دکھاؤں تجھ کو

اردو ادب کی تاریخ کے ضمن میں کبھی پڑھا تھا کہ ”ڈرامہ“ وہ
صنفِ سخن ہے جس میں زندگی کے حقائق کو مختلف مناظر کی پیش کش کے
طور پر مشتمل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں تنظیم کے روایتی تسلسل اور تو اتر کو
منظراً کشی کے مختلف گریزوں میں منقسم بھی کر دیا گیا اور ٹیپ کے شعر ع
میری محبوب ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو۔۔۔ کے حسین دھاگے میں ہر منظر کے
موتی پر کرسوچ اور اظہار کا خوبصورت گبرا بھی تیار ہو گیا یعنی یہ مرکزی
پیغام ہر مرحلے کی نقد کے دوران حاوی رہا کہ اصل ضرورت ظاہر و باطن
کی یکسانیت اور قول و فعل کے توازن کی ہے۔

جناب احمد نے انسانیت کی عظمت اور خود حضرت انسان کے ذاتی حوصلے اور ہمت کو ہر جگہ اپنی فکر اور بیان کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور اس میں مکمل کامیابی ہر مرتبہ ان کے قدم چوتھی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے نادر و نایاب اخلاقی قدرؤں اور انسانی جذبوں کی نمائندگی پر منی چند منتخب قطعات۔

زخم ہائے دل برباد چمک اٹھتے ہیں
چوٹ پڑتی ہے تو جذبات دمک اٹھتے ہیں
حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں میں جن سے
تار ہائے رگِ جاں تک بھی جھنک اٹھتے ہیں

.....

پیامِ امن و محبت سنانے آیا تھا
متاعِ عیش و مسرت لٹانے آیا تھا
یہ کیا ہوا مری آنکھوں میں آگئے آنسو
میں اس جہاں میں فقط مسکرانے آیا تھا

.....

زندگی کا پیام دے ساقی
امن کی صبح و شام دے ساقی
اب تو انساں نما درندوں کو
آدمیت کا جام دے ساقی

ہو کے مجبور بھی مختار بنا پھرتا ہے
 روز روشن میں سیہ کار بنا پھرتا ہے
 سچ جو پوچھو تو حقیقت ہے یہ اب احر کی
 سر پہ احباب کے اک بار بنا پھرتا ہے
 میری نظر میں زیر مطالعہ شاعری کا عنصر خاص فلکر کی گیرائی شدید
 اور خیال کی بلند پروازی ہے۔ ابتداء کہا گیا ہے کہ رسمی طور پر ہیئت،
 مضامین، الفاظ کی نشست و برخاست اور انداز بیان کے لگے بندھے
 ڈھروں پر غزلیہ اور نظمیہ شاعری کے درمیان حد تخصیص قائم کی جاتی ہے لیکن
 عظیم روی نقاد ”مینخائیل نودونوف“ نے اس سے قطعاً اختلاف کیا ہے اور
 منجملہ تمام تخلیقی فنکاروں کو فلکر (حقائق) یا جذبہ (تصور) ہی کے تحت پڑھنے،
 سمجھنے اور پرکھنے کے پیانے متعین کئے ہیں۔ معروف Pscyco-sex
 شاعر John Donne کے تجربے کے مطابق کوئی بھی حساس فرد جب
 قوتِ متخیلہ کو اظہار بیان سے ہم آہنگ کر لینے کا ہنر جان لیتا ہے تو اس کا
 لاشعوری Calibre یکنخت جاگ اٹھتا ہے اور وہ تخلیقی فنکار بن جاتا ہے۔
 اہم نکتہ یہ ہے کہ اولین فن پارے کے عالم وجود میں آنے کا جو سبب ہوتا ہے
 وہ تخلیقی صلاحیت کے ظاہر ہو جانے کے بعد خود لاشعور میں پناہ گزیں ہو جاتا
 ہے۔ اب اظہار و بیان کے زاویے، انداز Format تو مختلف ہو سکتے
 ہیں۔ لیکن ہر شہ پارے کا حقیقی پس منظروں ہی قرار پائے گا جو بذاتِ خود

لاشمور میں رہ کر تخلیقیت کو نئے نئے طریقوں سے مہیز کرتا رہتا ہے۔ جان ڈن کے اس اچھوتے پیمانے پر برتنے کے سلیقے نے علامتی شاعری کے بین السطور اور اندر ورن تو سین معانی و مفہوم کو بڑی عظمت و وسعت فراہم کی ہے۔ راقم نے (ایک بین الاقوامی سیمینار کے عنوان سے) استاد ذوق کی طبی اصطلاحات کے سیاسی پس منظر کا مطالعہ کیا تو نہ صرف یہ کہ قصیدے کے خیر سے انقلاب اور بغاوت کے شعلے بلند ہونے لگے بلکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کا حقیقی روح رواں اور بہادر شاہ کو ظفر بنانے والا ذوق اردو شاعری کا عظیم ترین محسن قرار پایا۔

معروضاتِ بالا سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ جناب احمد جس اچھوتے فکر، جس انوکھے اندازِ بیان اور جس مخصوص لب و لہجے و اسلوبِ نگارش کے مالک تھے ان تمام حرکات کا پس منظر دراصل وہ شدید احساس تھا جو سماج کے مختلف طبقات کے ظاہر و باطن کے تفاوت سے پیدا ہوا۔ زندگی کی منافقانہ روشن نے حسی دیانت اور مومنانہ صفتِ حق گوئی کو تقویت بخشی اور جناب احمد کی معرکۃ الآراء نظمیں صفحہ قرطاس پر اتر کر راجستان کے عظیم ادبی شعوری اور تخلیقی سرمایہ میں تبدیل ہو گئیں۔

مولانا حائلی کے اصولِ شاعری اور نعرہ ”انقلاب زندہ باد“ کے بعد اردو غزل کو ”آبرو“ اور ”وحشیت“ کی دو انتہاؤں میں مقید کرنا بیشک زیادتی ہو سکتی ہے لیکن ملاوجہی کی متفقی و مستحجع زبان کے مقابلے آج کے گلوبلاسیشن

اور کمپیوٹر ائریشن کا اگر شاعری کے کسی گوشے سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے تو وہ بقول شمس الرحمن فاروقی صرف ”شعرِ شعور انگلیز“، ہی سے ممکن ہے۔۔۔ ترقی پسند تحریک سے جہاں شعراء و ادباء کو اپنی فکری و تخلیقی صلاحیتیں سماجی انقلاب اور ملکی آزادی کے لئے بروئے کار لانے کا موقع ملا و ہیں صنفی ہمیتوں کو رسمی انداز میں برتنے کی بدعت سے بھی چھٹکارا ملا اور غزل کے اشعار بھی مجوزہ رنگ غزل (کی فرسودگی) سے باغی ہو کر حوصلہ مند یوں اور کڑوی سچائیوں کے اظہار سے نہ صرف یہ کہ متعارف ہوئے بلکہ اس طرز لازوال میں ڈھل کر خود بھی زندہ وجادہ ہو گئے۔

بھٹک نہ جائے کہیں کاروانِ فکر و نظر
چراغ دل کے جلاو کہ روشنی کم ہے
جسے کمال سمجھتی ہے دانشِ حاضر
مری نظر میں وہ احمر زوالی آدم ہے
میں عصرِ نو کا شاعر مری لئے نئی ہے احمر
ہے نئے ادب کا حامل میرا ذوقِ شاعرانہ

مذکورہ مقطع سے مسلک (غزل کے آخری) شعر میں وہ مضمون بیان کیا گیا ہے جس کی عام طور پر (شاید) لوگ موصوف سے توقع نہیں رکھتے ہوں گے لیکن مالک و بندے کے درمیان جو حقیقی تعلق ہے اس کا ادراک اور اظہار کس انداز سے اچانک بھی ہو جاتا ہے یہ آمد کے اس شعر

سے ظاہر ہے۔

تری شان بے نیازی مری ہمسفر ہے ورنہ
یہ مری شکستہ کشتی یہ ہوا مخالفانہ
دنیا کے ہر حادثے اور مصیبت کے مقابلے سینہ پر لیکن راضی ہے
رضائے مولیٰ رہنا انسان کے منصب خلافت کو ہی Justify کرتا ہے۔ لہذا
اس شاعرانہ تعلیٰ کو بھی بسر و چشم قبول کیا جانا چاہئے۔

زمانہ آج بھی شاہد ہے احر اس حقیقت کا
مرتب ہے یہ بزمِ دو جہاں میرے فسانے سے
دونوں مصروعوں میں حقیقت اور فسانے سے جو صفتِ حسنِ تضاد
تولد ہوئی وہ تو اپنی جگہ، لیکن ابہام جو عام طور پر مصروفہ اولیٰ میں ہونا چاہئے وہ
یہاں مصروفہ ثانی میں بھی ”شرطِ شعری“، نہیں ”جوازِ شعری“ کی صورت پایا
جاتا ہے۔ ایک اور حسین پیرا یہ ملاحظہ فرمائیں۔

نظر آتے ہیں سجدوں کے نشاں شاہوں کے ماتھے پر
وہاں شاہی باندازِ گدائی ہے جہاں میں ہوں
نگاہِ غیر میں احر کہاں ہے ظرفِ نظارہ
وہاں میری ہی نظروں کی رسائی ہے جہاں میں ہوں
عرفانِ ذات کے آئینے میں اسی قسم کے چند اور اشعار کی عکس
ریزی بھی قابل داد ہے۔

مجھے کچھ یاد آتی تو نہیں اپنی خطا لیکن
جھکا جاتا ہے سر میرانہ جانے کیوں نداشت سے

آئینہ میں ہے اک ایسی بھی تجلی اُمر
عالم ناز بھی خود جس سے خبر دار نہیں

لطف گھوارہ طوفاں کا کناروں میں کہاں
تشنگی موت کے ساحل سے بجھائی نہ گئی

پہلے پیدا کیجئے ذہن و نظر میں وسعتیں
پھر کسی کے دیکھنے کا دل میں ارمان کیجئے

اپنی حالت پہ ابھی آئی نہیں نبضِ حیات
آنے والا ہے ابھی اور بھی طوفاں کوئی

کبھی سوچا ہے تم نے اے نظامِ نو کے معمارو!
مشیت کے قرینے بھی بدل جائیں تو کیا ہوگا

حپ وطن اور آزادی کی تمنا اردو شاعری کا طرہ امتیاز رہا
ہے۔ آزادی کے تناظر میں اختر شیرانی کا یہ شعر ضرب المثل ہے ۔

عشق پر کردوں میں قربان اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پر میرا عشق بھی قربان ہے
اس زمرے میں جنگ آزادی کے دوران ملت مرحوم کی
عظمیم اور تاریخی قربانیوں (جنہیں موجودہ اربابِ اقتدار کھرچنے اور
مٹاڑا لئے کے عمل قبیح میں مصروف ہیں) کے سیاق و سبق کے ساتھ احمد
فرماتے ہیں۔

لف مے، کیفِ چمن، حسن سحر، رنگ شفق
اک نظر ہے اور جمالی کارواں ہے سامنے
خون اپنا بھی ہے احمد صرفِ تزیینِ چمن
داستاں در داستاں ہندوستاں ہے سامنے
اپنے تابناکِ ماضی اور تکمیلاتِ فرانس کی روشن تواریخ
کے باوجود آج ہم لوگ اپنے ہی وطن میں جس سلوکِ ناروا سے نبرد آزمائیں
اس کمپرسی کے باوجود شاعر نے دامنِ امید ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔
موسم گل میں تو ہے ہر وقت امکانِ جنوں
ہو جنوں احمد تو ہے ہر وقت امکانِ بہار

.....

بہت سنے ہیں فسانے اندر ہیری راتوں کے
اب آفتاب کے پہلی کرن کی بات کرو

اس سلسلے میں بغیر کسی تو پیچی لاف گزاف کے جناب احمد کی ایک
نماشندہ غزل جیوں کی تیوں پیش خدمت ہے ۔
اپنی درماندگی شوق میں پر پیدا کر
ہو سکے تو نئی منزل میں گذر پیدا کر

برق سے کھیل ہواں کے تھیڑوں سے نہ ڈر
خوف بن کر دل باطل میں بھی گھر پیدا کر

پاسِ ناموس ہے ناموسِ محبت میں حرام
جس کو ٹھوکر کی تمنا ہو وہ سر پیدا کر

عشق کو دے نہ نگاہوں کے قدس کا فریب
حسن کو جس کی طلب ہو وہ نظر پیدا کر

اہم اندریشہ پستی و بلندی سے گذر
اپنی دنیا میں نئے شمس و قمر پیدا کر

بصورتِ انسان اشرف الخلقات ہونا، ایمان کی دولتِ نایاب
سے سرفراز ہونا، ناموافق حالات کے باوجود خالقِ اکبر کی رحیمی و کریمی کے
تینیں پر امید رہنا اور ایمان پر خاتمے کے یقین جیسی عظیم نعمتوں کے علاوہ اللہ
کا ہم پر ایک اور (بلکہ سب سے بڑا) احسان یہ ہے کہ ہمیں امام الانبیاء

حبيب کریا، محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور کے ہر مکتبہ فکر و احساس سے متعلق اردو کے ہر شاعر نے نعت کے کچھ اشعار ضرور بالضرور کہے ہیں۔ احمد مرحوم نے بھی اپنی سعادت مندی کا بے حد خوش اسلوبی کے ساتھ اظہار فرمایا ہے ۔

احمر کا علم اس کے سوا اور کچھ نہیں
دیباچہ کتاب دو عالم ہیں آپ بس

.....

نہیں درکار احمد کو متاع تاج سلطانی
اسے کافی غلامی غلامانِ محمد ہے
مختصر یہ کہ ما قبل و ما بعد آزادی کے درمیانی و بحرانی دور میں افکار احمد
کی شکل میں جو کچھ ظہور پذیر ہوا اسی نے راجستان کی ادبی طور پر بے حس
مٹی کو نظم خیزی عطا کرتے ہوئے اس زمین سے ظفر غوری، خلیل تنوری، احمد
ریس، ممتاز راشد، ملا پ چندر آہی، مستان بیکانیری، منصور چوروی، سالک
جھن جھنوی، آزاد سیکری، نذر فتح پوری، خدادا دمولس، شر رایوی (اور شاید راقم
الالفاظ بھی) جیسے فکری اور تخلیقی اذہان کو ”کونپلے پھوٹنے سے تناور درخت
بننے تک“ کے موقع فراہم کئے۔

آخر میں اپنے مزاج اور فطرت کے عین مطابق ان تمام ارباب

حل و عقد کی طویل خاموشی اور بے اعتنائی پر ”ماتھی مون دھارن“، جو صرف ذاتی Pump & Show کی خاطرا کیڈ میز کے مایا جال میں الجھے مشاعرانہ تعیش کی خرستیوں میں غلن رہے۔ اور مردہ پرستی کی کئی روایتوں کو پروان چڑھانے کے باوجود راجستان کے اس اولین و بہترین نظم گو شاعر کے زندہ و جاوید افکار کو منصہ شہود پر لانے کی سعادت سے محروم رہ گئے۔ قابل صدمبار کباد ہیں وہ لوگ جنہوں نے بساط بھر سعی مخلصانہ کے تحت دستیاب شدہ انتخاب کو ماضی قریب میں زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کا عزم کیا۔۔۔ ”من دانم کہ من آنم“، کے اعتراف کے ساتھ احقر کی قلم برداشتہ تحریر صرف اپنی طالب علمانہ تشنگی کے اظہار کے طور پر پیش کردہ ایک سعی اخلاص ہے۔

شاہید کہ کسی دل میں اتر جائے مری بات



مرثیہ احمد مرحوم

اے گردش زمانہ یہ کیسا مذاق ہے دودن کی زندگی کا سکوں تجھ کو شاق ہے
 حیران عقل ہے یہ عجب اتفاق ہے صحیح وصال ہے کہ شامِ فراق ہے
 خوابیدہ شاعری کے مقدر کا سوگ ہے
 اے آنکھ خوب بہا کے یہ احمد کا سوگ ہے
 پروردہ بہارِ گلستانِ شاعری تفسیرِ زندگی تھا بے عنوانِ شاعری
 تھی جس کی شانِ واقعی شایانِ شاعری سمجھائے جس نے گیسوئے پیچانِ شاعری
 لبیک کہہ کے یوں بے صدائے اجل گیا
 نقشہِ فضائے شعر کا یکسر بدلتا گیا
 تھا زخمِ دل ہرا تو سبھی یاد آگئے دارفنا سے کوثر و بکل ۳ ہی کیا گئے
 عاصم ۲ گئے تو ناظم ۵ و شید ۶ عطا گئے شاعل ۸، شیم ۹، زیب ۱۰، کرم ۱۱ افضا ۱۲ گئے
 اور پھر اجل کا داؤ جواہر پہ چل گیا
 جے پور سے ادب کا جنازہ نکل گیا
 جے پور کے ادب کی فضا سوگوار ہے رنگ قمر ۳ ہے زرد صبا ۴ سوگوار ہے
 نالے ہیں بے اثر ۵ اتو دعا سوگوار ہے احمد کے غم میں جو ہے بجا سوگوار ہے
 جو کھو گیا وہ اب کبھی پایا نہ جائے گا
 یہ داخل آہ دل سے مٹایا نہ جائے گا

ہر وقت کیف شعر میں ڈوبا ہوا ملا ہر آن اپنے آپ میں کھویا ہوا ملا
 ہر لمحہ واقعات سے الجھا ہوا ملا حالات خواہ کچھ ہوں وہ ہنستا ہوا ملا
 جس بزم میں گیا ، وہ ہزاروں میں فرد تھا
 ”حق مغفرت کرتے عجب آزاد مرد تھا“

- ۱ عبد الرشید احمد تقیم ملک کے بعد راجستان کے ترقی پسند اور جدید لب والجہ کے نمائندہ نظم گوشاعر تھے۔
- ۲ مولانا منظور احمد کوثر تلمیذ حضرت مائل دہلوی۔
- ۳ منصور علی خاں بیکل تلمیذ حضرت آگاہ
- ۴ عبد الوہاب خاں عاصم
- ۵ ناظم عزیزی سنبلی
- ۶ عبد الغفور شیدا تلمیذ حضرت کوثر
- ۷ غشی عطاء اللہ خاں عطا
- ۸ مولانا احترام الدین احمد شاعر
- ۹ افتخار احمد شمیم کا کوروی
- ۱۰ منور حسین زیب دہلوی
- ۱۱ نواب مکرم علی خاں آپ پہاسو
- ۱۲ محمد ایوب خاں فضا
- ۱۳ محمد ایوب قمر واحدی
- ۱۴ طوطی راجستان غشی چاند بہاری لال صبا
- ۱۵ قاضی امین الدین اثر

نعت ۱۹۵۸ء

بیان کس طرح ہو سکتی ہے جو شانِ محمد ہے
 کہ مضمونِ دو عالمِ زیرِ عنوانِ محمد ہے
 بقدر نظر و ذوقِ بادہ کش ملتی ہے مئے درنہ
 زمیں سے آسمان تک عامِ فیضانِ محمد ہے

جہاں دل کا ہر ذرہ حریفِ شمع بینا ہے
 کہ روشنِ اس میں شمع روئے تابانِ محمد ہے

اُدھر آ او متاع کامرانی ڈھونڈنے والے
 متاع کامرانی زیرِ دامانِ محمد ہے

نہیں درکار اُحمرِ کومتاعِ تاجِ سلطانی
 اسے کافی غلامی غلامانِ محمد ہے



نعت

(نومبر ۱۹۵۳ء)

گواہی دے رہا ہے ہر نظارہ یا رسول اللہ
تم ہی ہواصل میں کوئین آرا یا رسول اللہ

زمانہ اب سمجھتا جا رہا ہے اس حقیقت کو
تمہی نے زلف گیتی کو سنوارا یا رسول اللہ

ہر ایک اپنارہا ہے آپ کے ذریں اصولوں کو
حقیقت ہے یہ عالم آشکارا یا رسول اللہ

وہ مغرب کا نیتائ ہو کہ مشرق کا گلستان ہو
سبق لیتا ہے تم سے ہر ادارا یا رسول اللہ

اُبھرنا چاہتی ہے آج بھی ڈوبی ہوئی کشتی
تمہارے نام کا لے کر سہارا یا رسول اللہ

اجالوں پر ہوا جاتا ہے پھر غلبہ ان دھیروں کا
دکھا دو پھر جمال عالم آرا یار رسول اللہ

ہوا مجروح کچھ ایسا حادث کے تھیڑوں سے
ہے غم سے دامنِ دل پارا یار رسول اللہ

ان آنکھوں سے نہاں ہے جنسِ شبنم کی سحرتالی
مری جانب بھی ہواب تو اشارا یار رسول اللہ

قسم ان کالی زلفوں کی صفت وا لیل ہے جن کی
بہت مشکل میں ہے آخر تمہارا یار رسول اللہ

(۱۵ نومبر ۱۹۵۳ میں ایک مشاعرے میں پڑھی گئی)

نعت

(جون ۱۹۵۸ء)

تسکینِ قلب چارہ گر غمِ تمہی تو ہو
کہتے ہیں جن کو رحمتِ عالمِ تمہی تو ہو

تخلیقِ جن کے واسطے دونوں جہاں ہوئے
وہ ذات پاک نورِ مجسمِ تمہی تو ہو

کھولا ہے تم نے عقدہِ اسرارِ کائنات
اسرارِ کائنات کے محرمِ تمہی تو ہو

تم نے دیا ہے امن و مساوات کا پیام
شیرازہ بند ہستی برہم تم ہی تو ہو

زندہ کیا ہے تم نے ہی رسمِ خلیل کو
وجہ فروغِ عظمت آدم تم ہی تو ہو

نعت

تم نے دیا ہے گریہ یعقوب کو خراج
یعنی علاج دیدہ پر نم تم ہی تو ہو

ہر نامراد دل کے لئے ساحل امید
ہر غم زدہ کے مونس وہدم تم ہی تو ہو

تم نے لگائے عظمت عیسیے میں چار چاند
رتبه شناس دامنِ مریم تم ہی تو ہو

آخرِ کاعلم اس کے سوا اور کچھ نہیں
دیباچہ کتاب دو عالم تم ہی تو ہو

(۳۰ جون ۱۹۵۸ کو آل انڈیا ریڈ یو بے پور سے نشر ہوئی)

صوفیانہ

۱۹۵۳ء

جب دیدہ دل کی محفل میں وہ انجمن آ را ہوتا ہے
 اس وقت حریف کا ہکشاں قمرت کا ستارا ہوتا ہے

طوفان کے براہم موجود سے آواز تمہاری آتی ہے
 جب ناؤ بھنور میں ہوتی ہے جب دور کنارا ہوتا ہے

اللہ رے حکم شاہ حذی اللہ رے لطفِ شانِ خدا
 تقدیر کے درکھل جاتے ہیں جس وقت اشارا ہوتا ہے

اے حسنِ چراغ راہ گزرائے رہرو راہ قلب و نظر
 ہر رہرو راہ منزل کو تیراہی سہارا ہوتا ہے

جب پچھلے پھر معروف سفر مخصوص ستارے ہوتے ہیں
 اس وقت نگاہِ احمر میں ایک خاص نظارہ ہوتا ہے



نعت اکتوبر ۱۹۵۵ء

میں عرض کروں آپ سے کیا سرورِ عالم
 عالم ہے بہت شعلہ فزا سرورِ عالم
 چھائی ہے اجالوں پہ اندھیروں کی سیاہی
 تاریک ہے دنیا کی فضا سرورِ عالم
 ہر سمت ہیں آفات و مصائب کے تلاطم
 ہر سمت ہے سیلاں و بلا سرورِ عالم
 ہے حق کا یہاں نام بھی اب جرم میں داخل
 باطل کا ہے اک حشر پا سرورِ عالم
 گم تابشِ ایماں بھی ہے سونے کی دمک میں
 دولت کی ہے اس درجہ ہوا سرورِ عالم
 یہ دولت و حشمت ہوزمانے کو مبارک
 ہم کو نہیں کچھ اس کا گلہ سرورِ عالم
 جیتے ہیں تیرے نام کا لے لے سہارا
 کافی ہے ہمیں تیری ولا سرورِ عالم
 آنج آئے نہ آئینہ ایماں پہ ہمارے
 آخر کی یہ ہے تم سے دعا سرورِ عالم

نعت

۱۹۵۵ء

اے صل علی صل علی سرکارِ دو عالم آتے ہیں
 کونین میں ہے یہ شور بپا سرکارِ دو عالم آتے ہیں
 کیا حور و ملک کیا جن و بشر کیا غنچہ و گل کیا نہش و قمر
 ہے بزم دو عالم نغمہ سرا سرکارِ دو عالم آتے ہیں
 ہے چاند میں پہاں جن کی چمک پھولوں میں نہاں ہے جن کی مہک
 وہ آئینہ انورِ خدا سرکارِ دو عالم آتے ہیں
 اک بوریا جن کا بستر تھا اور نانِ جو میں تھی جن کی غذا
 وہ مالک و ملکِ ارض و سما سرکارِ دو عالم آتے ہیں
 وہ جن کی تجلی کی احرِ ایک عمر سے تھی مشتاقِ نظر
 وہ پیکرِ حسنِ صدق و صفا سرکارِ دو عالم آتے ہیں

منقبت

۱۹۵۵ء

ہر لب پہ پاک نام جناب علی کا ہے
 ہر دل میں احترام جناب علی کا ہے
 وہ مرتبہ میں عرشِ الہی سے کم نہیں
 جس دل میں بھی قیام جناب علی کا ہے
 ہر سو کھلے ہیں بادۂ عرفان کے میکدے
 جاری یہ فیضِ عام جناب علی کا ہے
 روشن جہاں میں شمعِ رسالت ہے آپ سے
 ظاہر ہے جو مقام جناب علی کا ہے
 اس کو نہیں ہے حاجتِ تاجِ سکندری
 دنیا میں جو غلام جناب علی کا ہے
 فکرونظر کو جس نے عطا کی ہے روشنی
 وہ دل نشین کلام جناب علی کا ہے
 جو تھا پیام حضرت خیر الانام کا
 اُخْرَ وَهِيَ پیام جناب علی کا ہے

منقبت

(ماہنامہ عقیدت دہلی میں ۱۹۵۵ء کو شائع ہوئی)

سنے تمہارے سوا کون یا غریب نواز
 شکستِ شیشہ دل کی صدا یا غریب نواز
 تمہارے نام سے اب بھی جہاں میں روشن ہے
 چراغ راہِ حقیقت نما یا غریب نواز
 پناہِ دامنِ رحمت نے دی وہیں اس کو
 ہجومِ یاس میں جس نے کہا یا غریب نواز
 نہ مال و زر کی ہوس ہے نہ تاج شاہی کی
 ہے بے نیاز گدا تمہارا یا غریب نواز
 جسے جو چاہو زمانے میں تم عطا کردو
 خدا کے تم ہو تمہارا خدا یا غریب نواز
 تمہارے درپہ پہنچکر رہی نہ اُمر کو
 تمیزِ عظمت شاہ و گدا غریب نواز

نعت

۱۹۵۳ء

جس وقت تصور میں میرے وہ جلوہ کامل ہوتا ہے
میں محو نظارہ ہوتا ہوں سجدے میں مرادل ہوتا ہے

اللہ رے فیض عام ترا جس نے بھی لیا جب نام تیرا
آسان اسی دم ہوتا ہے جو کام بھی مشکل ہوتا ہے

اے زینت حسن و شام و سحر ہو مجھ کو بھی اب تو اذن سفر
جب کوئی مدینے جاتا ہے بیتاب میرادل ہوتا ہے

اللہ رے عشق شاہ ہدی اللہ رے لطف شان خدا
گرداب میں منزل ہوتی ہے طوفان میں ساحل ہوتا ہے

پھر ہونے لگا ہے اب مجھکو احساس غم و آلام جہاں
یا شاہ مدینہ ایک نظر بیتاب میرادل ہوتا ہے

آزادیاں اس کے قدموں پر آآ کے تصدق ہوتی ہیں
جو عشق محمد میں اُمر پاند سلاسل ہوتا ہے

غزل

۱۹۵۲ء میں اپریل

نگاہ شوق کا حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں
جنونِ عشق کی منزل نہیں تو کچھ بھی نہیں

عیشت ہے جلوہِ حسن بہار کی نزہت
چمن میں شورِ عناidel نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہوا کرے دلِ مضطربِ حریفِ جلوہِ عود
تری نگاہ کا حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں

نہ کر غرور کہ زاہدِ جبین سجدہ فروش
نیازِ عشق کے قابل نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہارِ حسن بہت کچھ سہی مگر آخر
مری نگاہ جو شامل نہیں تو کچھ بھی نہیں

غزل

۱۹۵۳ء

اپنی درمانگی شوق میں پر پیدا کر
ہو سکے تو کسی منزل میں گزر پیدا کر

برق سے کھیل حادث کے تھیڑوں سے نہ ڈر
خوف بن کر دل باطل میں گزر پیدا کر

پاس ناموس ہے ناموس محبت میں حرام
جس کو ٹھوکر کی تمنا ہو وہ سر پیدا کر

عشق کو دے نہ نگاہوں کے تقدس کا فریب
جس کو جس کی طلب ہو وہ نظر پیدا کر

آخر اندیشہ پستی و بلندی سے گزر
اپنی دنیا میں نئے نئے شمس و قمر پیدا کر

غزل

فروری ۱۹۵۲ء

نمایاں سو زغم کی لو ہے ہر اک آشیانے سے
 نہیں فرحت زمانے میں کسی کو غم اٹھانے سے
 فضا تبدیل ہوتی جا رہی ہے نظم گلشن کی
 چمن محروم ہوتا جا رہا ہے مسکرانے سے
 زمانے میں وہی ہیں دولت کو نین کے ماں
 حقیقت میں جنہیں نسبت ہے تیرے آستانے سے
 کہاں ہے اب زمانے میں وہ لطف خانہ دیرانی
 کہ اب تو برق بھی گرتی ہے پچ کر آشیانے سے
 اٹھانی ہی پڑیگی زندگی کی تہمت بے جا
 مجھے مٹنے نہ دیگی آرزو تیری زمانے سے
 زمانہ آج بھی شاہد ہے احر اس حقیقت کا
 مرتب ہے بزمِ دو جہاں میرے فسانے سے

نظم

(۱۹۵۳ء)

وہ مجاہد جو نظامِ حریت کی جان تھے
 وہ مجاہد جو ادائے فرض پر قربان تھے
 وہ مجاہد جن کے ہاتھوں میں تھی دنیا کی لگام
 قیصر و کسری بھی کرتے تھے جنہیں جھک کر سلام
 وہ مجاہد جن کے لب پر تھی صدائے لا الہ
 وہ مجاہد تیز تھی تلوار سے جن کی نگاہ
 کھلیتا تھا موت سے جن کے ارادوں کا شباب
 جن کے جامِ زندگی میں تھی عزادم کی شراب
 کاش ان کا سادل شعلہ فشاں تجھ کو ملے
 کاش ان کی سی حیات جاؤ داں تجھ کو ملے
 بو عبیدہ کا تجھے جذبِ صداقت ہو نصیب
 خالدِ جاں باز کا عزمِ شجاعت ہو نصیب
 تیرے سرپہ فلن ہو مدینہ کی فضا
 تیرے مقصد کے موافق ہوزمانے کی ہوا

غزل

نہ برہمن کو ہے عرفان نہ شیخِ محرم ہے
جہاں میں کشمکش کفرو دیں کا عالم ہے

ہر ایک گام پر دل کو شکست پہم ہے
میری جفا طلبی کی یہ داد کیا کم ہے

ازل سے شمع محبت ہے ضو فشاں لیکن
ابھی جہاں میں وہی ظلمتوں کا عالم ہے

یہ انقلاب حرم ہی میں کچھ نہیں زاہد
ضم کدے کی فضا میں بھی دلکشی کم ہے

جنونِ فکر و مداوائے غم نہیں مجھ کو
میری نگاہ میں اُحمرِ حقیقتِ غم ہے

غزل

نہ سوزِ دل میں کمی ہے نہ آنکھ پر نم ہے
غمِ حیات کا کتنا عجیب عالم ہے

بھٹک نہ جائے کہیں کاروانِ فکر و نظر
چراغ اور جلاو کہ روشنی کم ہے

یہ چیز ہے وہ جو مانگے سے مل نہیں سکتی
خدا کی دین زمانے میں دولتِ غم ہے

کے سناوں میں دارورس کے افسانے
مری نوابے انا الحق کا کون محرم ہے

جسے کمال سمجھتی ہے دانش حاضر
میری نگاہ میں اُحَمَر زوالِ آدم ہے

غزل

خرمن دل پہ میرے برق گرائی نہ گئی
یوں نقاب اس نے اٹھائی کہ اٹھائی نہ گئی

لاکھ چاہا مگر آثارِ الہم چھپ نہ سکے
ان سے بھی آج ہنسی میری اڑائی نہ گئی

دو جہاں میں مجھے افسانہ بنایا کرچھوڑا
داستاں ان سے محبت کی چھپائی نہ گئی

لطف گہوارہ طوفان کا کناروں میں کہاں
تشنگی موج کی ساحل سے بجھائی نہ گئی

دل میں آخر کے جو نازک سی خلش بن کے رہی
بات وہ ان کی نگاہوں میں بھی پائی نہ گئی

غزل

۱۹۵۳ء

نہ کسی دعا کی ہے جبجو نہ کسی اثر کی تلاش ہے
جو کسی کے قلب کو جیت لے مجھے اُس نظر کی تلاش ہے

یہی عمر بھر کا ہے تجربہ یہی عمر بھر کی تلاش ہے
اسے رہنوں کی کمی نہیں جسے راہبر کی تلاش ہے

ابھی ناتمام ہے سوزِ غم ابھی بے اثر ہے فغانِ دل
مجھے راہِ منزلِ عشق میں ابھی بال و پر کی تلاش ہے

میں اسیرِ زلفِ مجاز ہوں تو حقیقوں کے فریب میں
تجھے اک خدا کی ہے جبجو مجھے اک بشر کی تلاش ہے

ابھی شورِ دیر و حرم بھی ہے ابھی نالہ کش ہے جہانِ غم
ابھی حسنِ زیر نقاب کو کسی دیدہ ور کی تلاش ہے

میرا فقر میری شہنشہی میرا بجز میری سکندری
مجھے احران سے غرض ہے کیا جنہیں بال و پر کی تلاش ہے

غزل

فضائے حرم سے سلام آرہے ہیں
جنوں کے لئے کچھ پیام آرہے ہیں

بہاروں کے خونیں نظام آرہے ہیں
محبت کے نازک مقام آرے ہیں

مبارک ہوا میرے دل کی امنگو
شہادت کے رنگین جام آرہے ہیں

دل و جان لٹانے کو جی چاہتا ہے
کچھ ایسے نظر اہتمام آرہے ہیں

فضا جن میں ہوتی ہے جذب جنوں کی
محبت کے وہ صبح و شام آرہے ہیں

نہ کیوں اپنی قسمت پہ نازاں ہوں احر
پیام جنوں میرے نام آرہے ہیں

غزل

بھرے ہیں جن کے سینے نفرت و بغض و عداوت سے
انہیں اے ہم نفس کیا کام ہے جذبِ محبت سے

مجھے تو یاد آتی ہی نہیں اپنی خطا کوئی
جھکا جاتا ہے سر میرا نہ جانے کیوں ندامت سے

یہ کششی ہے یہ موجیں ہیں یہ طوفان ہے وہ منزل ہے
کھڑے کیا دیکھتے ہو دوستو ساحل کو حسرت سے

بتائیگا وہ کیا راز درون پردة ہستی
کہ جو انساں خود واقف نہیں اپنی حقیقت سے

کوئی ہم سے بھی پوچھے کاش تم کو کیا شکایت ہے
ہمارا دل بھی ہے لبریز اے احر شکایت سے

قطعہ ۱۹۵۰ء

خون کے چھینٹوں سے گلرگ ہے دامنِ بہار
 اہل گلشن میں نہیں صاحب عرفان کوئی
 ہرتبا، ہی میں ہے مستور میرا افسانہ
 میری بر بادی کا احمر نہیں عنوان کوئی

قطعہ ۱۹۵۰ء

پسینہ بن کے خون احساس کی رگ رگ سے رستا ہے
 غردوں نفس و زرداری کے انگاروں پہ چل سکتا ہے
 وہاں پر ذکر ہی کیا ہے وقار آدمیت کا
 جہاں پر آدمی چاندی کے چند سکوں میں بکتا ہے

قطعہ ۱۹۵۰ء

دیکھی جو فرشتوں نے شرارت میری
 اللہ سے کی جا کے شکایت میری
 غصہ تو بہت آیا خدا کو لیکن
 دیکھی نہ گئی قہر سے صورت میری

مشنی پر میم چند اگست ۱۹۵۳ء

اے کہ تیرے نام سے روشن چراغِ علم و فن
اے کہ تیرے نام سے تاباں ادب کی انجمان

گلشنِ علم و ادب میں ہے بہار آئی ہوئی
تیری شمع فکر کی ہے روشنی چھائی ہوئی

آج بھی پھولا پھلا ہے تجھ سے اردو کا چمن
آج بھی بھولے نہیں تجھ کو تیرے اہل وطن

تیری تصنیفیں ہیں مشہور زمانہ آج بھی
بچے بچے کی زبان پر ہے فسانہ آج بھی

تیری تحریروں میں پہاں انقلابی رنگ ہے
تیری تالیفوں میں پوشیدہ عقابی رنگ ہے

فلسفہ تیرے ادب کا تھا براۓ زندگی
تونے لکھا ہی نہیں کچھ بھی وراۓ زندگی

زندگی کی تلخیوں میں بھر کے لفظوں کا مٹھاں
تونے پہنایا فسانے کو حقیقت کا لباس

کیا سمجھ سکتے ہیں تجھ کو عصر حاضر کے ادیب
کا گل و رُخسار کی رنگین مھفل کے نقیب

ان کے افسانوں کا نفسِ مدعای کچھ بھی نہیں
ایک لڑکا ایک لڑکی کے سوا کچھ بھی نہیں

ان کے کرداروں کا جزوِ خاص ہیں حسن و شباب
جھونپڑوں میں ان کو آتے ہیں نظرِ محلوں کے خواب

اپنے گرد و پیش پر پڑتی نہیں ان کی نظر
مضھل انسانیت کی کچھ نہیں ان کو خبر

جس ادب کو زندگانی سے نہ ہو کچھ واسطہ
دوستویے ادب سے ملک کو کیا فائدہ

قطعہ (۱۹۵ء)

زندگی کے پیام دے
امن کے صبح و شام دے ساقی
اب تو انساں نما درندوں کو
آدمیت کا جام دے ساقی

نظم (جشنِ آزادی - ۱۹۵۴ء)

شکر صدر شکر کے آزاد وطن ہے اپنا
 پھول اپنے ہیں کلی اپنی چمن ہے اپنا
 خشک و تراپنے ہیں گزار و گلتاں اپنے
 بحر و برد اپنے ہیں کھساروں بیاں باں اپنے
 ہند آزاد غلامی سے ہوا آج کے دن
 جس قدر عیش منائیں ہے روا آج کے دن
 ہم نشیں تیرا یہ ارشاد بجا ہے لیکن
 جامِ عشرت ترا اشکوں سے بھرا ہے لیکن
 چند ہونٹوں پہ جو کھیلے وہ تبسم کب ہے
 چند موجودوں میں جو آئے وہ تلاطم کب ہے
 لطف جب ہے کہ ہر اک رُخ پہ مسرت چھلکے
 جشنِ زادی کا ہر بزم میں ساغر چھلکے
 آج آزاد ہوئے ہو گئے پورے چھ سال
 لیکن اب تک بھی ہے چہروں پہ جمی گرد ملال

صرف محلوں میں ہے آزادی کی تباہ کی ضایاء
 جھونپڑوں میں ہے ابھی تک وہی مٹی کا دیا
 جب کہ آزاد غلامی سے وطن ہے اپنا
 پھر یہ کیوں مثلِ خزاں رنگ چمن ہے اپنا
 شکوئے کیوں آج بھی گھر گھر میں ہیں ناداری کے
 لوگ دوچار ہیں کیوں آج بھی بیکاری سے
 بستیاں بھوکی ہیں کیوں آج بھی انسانوں کی
 کھیتیاں سوکھی ہیں کیوں آج بھی دہقانوں کی
 آج کیا ملک میں برسات نہیں ہوتی ہے
 دن نہیں ہوتا ہے یا رات نہیں ہوتی ہے
 کیا وہ پہلا سا نہیں آج مشیت کا نظام
 کیا بدل ڈالے ہیں قدرت نے اب اپنے احکام
 جب کہ عالم ہے وہی صبح وہی شام وہی
 میکدہ ہے وہی ساقی ہے وہی جام وہی
 پھر یہ جتنا میں بپا شورِ قیامت کیوں ہے
 ہر طرف ملک میں افلas و فلakت کیوں ہے

لوگ فاقوں کی مصیبت سے نہ گھبرا جائیں
 شیشے پتھر کی چٹانوں سے نہ ٹکرا جائیں
 میرا پیغام سنادو یہ بعنوان عمل
 اب بھی ہے وقت کہ اے وقت کی سرکار سمنجھل

قطعہ

دل سینے میں جب شعلہ فشاں ہوتا ہے
 ہر سمت فضاوں میں دھواں ہوتا ہے
 احساس پہ ہو جاتی ہے وحشت طاری
 پھولوں پہ بھی کانٹوں کا گماں ہوتا ہے

قطعہ

امریکہ اور پاکستان کے پیکٹ پر (فروری ۱۹۵۳ء)
 آ کے انغیار کی باتوں میں چمن ٹھیج دیا
 اپنے اسلاف کی لاشوں کا کفن ٹھیج دیا
 جو بہایا تھا غریبوں نے وطن کی خاطر
 تم نے وہ خونِ شہیدان وطن ٹھیج دیا

قطعہ (۱۹۵۳ء)

عشق میدان وفا میں کبھی ہارا تو نہیں
 دل نے گھبرا کے کبھی تجھ کو پکارا تو نہیں
 مجھ سے کیوں برس پیکار ہیں آلام جہاں کے
 اس میں اے دوست کہیں تیرا اشارہ تو نہیں

قطعہ ۱۹۵۳ء

ایک نیا راگ نیا گیت سناتی ہے تجھے
 اک نیا موڑ نئی راہ بتاتی ہے تجھے
 عہدِ رفتہ کی شکستوں سے نہ گھبرا ساقی
 یہ نئی صبح نئی شام دکھاتی ہے تجھے

بہت سنے ہیں فسانے اندھیری راتوں کے
 اب آفتاب کی پہلی کرن کی بات کرو
 ہے ذکر کیا یہاں نیل و فرات کا احمر
 یہ ہند ہے یہاں گنگ و جمن کی بات کرو



نظم (ائیش)

جوں ہی آجاتے ہیں ایام ایش کے قریب
 آنے لگتے ہیں نظر ان کو زمانے کے غریب
 اس قدر آپ کو ہوتا ہے غریبوں کا ملال
 دل سے مٹتا ہی نہیں ان کا کسی وقت خیال
 ووٹ ڈلانے کو لے جاتے ہیں موڑ میں انہیں
 اور واپس بھی پہنچاتے ہیں موڑ میں انہیں
 پیش یوں جذبہ ایثار کی کرتے ہیں دلیل
 یعنی پولنگ پر لگواتے ہیں پانی کی سبیل
 الغرض خوب غریبوں کی مدد کرتے ہیں
 اس قدر خلق دکھاتے ہیں کہ حد کرتے ہیں
 منتخب جب کسی حلقة سے یہ ہو جاتے ہیں
 پاؤں پھیلا کے پھر آرام سے سو جاتے ہیں
 خوب کرتے ہیں بلیک اور مگن رہتے ہیں
 غم نہیں بھوکے اگر اہل وطن رہتے ہیں
 میری محبوب ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو
 روپ اس دور کے انساں کا دکھاؤں تجھ کو

خواب احساس اکتوبر ۱۹۵۳ء

(سن ۱۹۷۲ء کے واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

نیند آتی ہی رہی وقت گزرتا ہی گیا
 خواب آتے ہی رہے اور میں سوتا ہی رہا
 میں نے دیکھا کہ میں اک خواب گہہ ناز میں ہوں
 منزل زیست کے گھوارہ آغاز میں ہوں
 عمر آغاز کے گلشن میں چہلتا ہوں میں
 خندہ گل کی فضاؤں میں مہلتا ہوں میں
 میں نے دیکھا کہ بلا میں میری لیتا ہے کوئی
 میں نے دیکھا کہ مجھے اور یاں دیتا ہے کوئی
 اپنے ماں باپ کی پرشوق تمنا ہوں میں
 جس کو کھلنے کی ہے حسرت وہ شگوفہ ہوں میں
 صحن غایب چوں کے ہیں میرے مخلنے کے لیے
 چاندی سونے کے کھلونے ہیں بہلنے کے لیے

پرورش ہوتی ہے سونے کی دمک میں میری
زندگی پلتی ہے چاندی کے کھنک میں میری

اک انا بھی ہے نوکر میری خدمت کے لیے
میرے گھوارہ عشرت کی حفاظت کے لیے

باب بیٹوں کی محبت میں ترستے دیکھے
بھائی بہنوں کی جدائی میں تڑپتے دیکھے

بیوی شوہر سے بچھڑتے ہوئے دیکھی میں نے
ماںگ موتی کی اجرتے ہوئے دیکھی میں نے

ظلم انسان کے انسان کو سہتے دیکھا
خون پانی کی طرح راہ میں بہتے دیکھا

میں نے دیکھا میری کاشانہ عشرت کے قریب
خون آلووہ پڑا ہے کوئی بیچارہ غریب

تلخی موت کا رُخار پہ چھایا ہے سکوت
میں نے دیکھا کہ وہ ہے میری انا کا سپوت

میں نے سوچا کہ یہ ہے رنگ زمانہ کیا
 دفتاً آکے میری پیٹھ پہ اک تیر لگا
 زندگی موت کے طوفاں سے ہم آگوش ہوئی
 شمع ہستی میری اک آن میں خاموش ہوئی

جام احساس میں زہر آب ٹپکتا ہی رہا
 اور یاں دیکے مجھے عیش تھپکتا ہی رہا
 نیند آتی ہی رہی وقت گزرتا ہی گیا
 خواب آتے ہی رہے اور میں سوتا ہی رہا

(یہ نظم ۱۹۷۲ء کے واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے)

غزل

اگست ۱۹۵۸ء

اے دوست ایک دن تھیں میرے اختیار میں
 یہ مستیاں جو کھیل رہی ہیں بہار میں
 جو کارروائی شوق میرے ساتھ تھا کبھی
 کھویا ہوا ہوں اب میں اس کے غبار میں
 اے کاش ہسنے والے کبھی یہ بھی دیکھتے
 ہیں کتنے اشک چشمِ عروسِ بہار میں
 ہے ان کا دست ناز مرے دستِ شوق میں
 دونوں جہاں ہیں آج میرے اختیار میں
 وہ کیا کریں گے دورِ خزان میں چمن کا غم
 اشکوں سے کھلتے ہیں جو عہدِ بہار میں
 میں انتہائے شوق میں حد سے گزر گیا
 اور اہل کارروائی ہیں میرے انتظار میں
 احر پکار اٹھیں وہ مجھے ہو کے بے قرار
 اتنا اثر تو ہے میرے دل کی پکار میں

نظم (حسن آوارہ)

اپریل ۱۹۵۳ء

روپ میں انسانیت کے پیکر برق و شرار
جاری ہے اک حینہ راہ میں متانہ دار

بے حیائی سے دوپٹہ دوش پر ڈھلکا ہوا
بزم ناؤ نوش میں اک جام سا چھلکا ہوا

شرم کہتے ہیں کے اس لفظ سے واقف نہیں
تاکنے والوں کی نظروں سے ذرا خائف نہیں

جاری ہے نوجوانی کے نشے میں جھومتی
شہر کی فٹ پاتھ پر دندناتی گھومی

جانے کیا دیکھا کہ حیرت سے ٹھٹک کر وہ گئی
شوq کی تاریک راہوں میں بھٹک کر رہ گئی

تک رہی ہے مرد کی صورت کو لچائی ہوئی
شرم سے نسوانیت کی دل میں اُستائی ہوئی

ہر ادا آوارگی شوق کی غماز ہے
فطرتِ گستاخ گویا مائل پرواز ہے

دیکھ کر یہ بے حیائی شاہراہ عام پر
ہنس رہی ہیں غیرتیں بے غیرتی کے کام پر

کشته تہذیب مغرب یہ ہماری بیٹیاں
سینئہ تہذیبِ مشرق پر ہیں اک سنگ گراں

بیچتی پھرتی ہیں راہوں میں بہ آواز دہل
باپ کی گپڑی کا طرہ بھائی کی موچھوں کا بل



ٹیکس ۱۹۵۳ء

(۱۹۵۳ء میں جے پور میونسپل ٹکس کے خلاف عوام نے شدید احتجاج کیا تھا جس نے با قاعدہ اک بڑے واقعہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس میں عوام کا کافی نقصان ہوا تھا۔ مسلسل پندرہ بیس دنوں تک مکمل ہڑتال رہی۔ لا تعداد گرفتاریاں ہوئیں۔ یہ نظم واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ یہ نظم پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ احمد اس واقعہ سے کس قدر متاثر تھے)

شور ہے پور میں ہے آج یہ بربپا کیا
جھنچھناتی ہے فضاوں میں یہ کیسی آواز
ظلمت و جبرا طاری ہے ہر اک سمت دھواں
دشت کے روپ میں بدلا ہے چمن کا انداز
خوف و دہشت کی خدائی ہے گلی کوچوں میں
بند بازار ہیں ماحول پہ چھایا ہے جمود
جو شغیرت سے ہیں بھڑکے ہوئے لوگوں کے دماغ
پائی جاتی ہے ہر اک دل میں بغاوت کی نمود
دیکھے پاتے ہیں اگر شہر میں لوگوں کا ہجوم
لاثھیاں لے کے لپکتے ہیں حکومت کے غلام

تیوری قانون کی کچھ اور بھی چڑھ جاتی ہے
 جب سوال اہل حکومت سے یہ کرتے ہیں عوام
 ہم سے وعدہ یہ ایکشن میں کیا تھا تم نے
 کام جتنا کی بھلائی کا کریں گے ہر دم
 اور دیکھیں گے اگر بات کوئی اس کے خلاف
 کر سیاں چھوڑ کے فوراً ہی چلے آئیں گے ہم
 اپنے وعدے کی صداقت کو نبھانے کے بجائے
 ظلم سہنے کے لیے اور دباتے ہو ہمیں
 کیا اسی واسطے کل ووٹ دیے تھے تم کو
 آج بندوق کی گولی سے ڈراتے ہو ہمیں
 ہم کسی ایسی حکومت کے طرفدار نہیں
 جس کو جتنا کی بھلائی کا ذرا پاس نہ ہو
 ہم ہر اک ایسے ادارے کو کچل ڈالیں گے
 جس کو جمہور کے دکھ درد کا احساس نہ ہو
 کپڑا ملتا ہے پہننے کو نہ رہنے کو مکان
 زندگی کے لیے آرام کہاں سے لاائیں
 پیٹ بھرنے کو میسر نہیں ہوتی روٹی
 لیکن دینے کو تمہیں دام کہاں سے لاائیں

غزل

جو قدم قدم پہ محیط تھے وہ تمام اندر ہے ہنادیے
مری رہ گزارِ حیات میں یہ چراغ کس نے جلا دیے

بڑی احتیاط سے امتحان لیے مری ذوقِ نگاہ کے
کبھی مجھ کو تابِ جمال دی کبھی ہوش میرے اڑادیے

جو کسی گماں میں نہ آسکے جنہیں چھو سکے نہ نظر میری
وہ مقام عالمِ ناز کے مجھے اک ادا میں دکھا دیے

یہ ہوا یہ موج یہ رنگ و بو انہیں دے سکے نہ نشاطِ دل
تیری بادہ ریز نگاہ نے جنہیں جام بھر کے پلا دیے

تجھے کیا کہوں میں اے چشمِ نم کیا تو نے مجھ پہ یہ کیا کرم
تھے وہی تو جوہر بے بہا جو چھلک کے تو نے لٹا دیے

ہیں اصولِ منزلِ عشق کیا مجھے اُخراں کی خبر نہ تھی
مگر اک نگاہِ جلال نے سب اصولِ مجھے سکھا دیے

غريب کی عید

چھپٹے کا وقت ہے اور رات کی تمہید ہے
ہر مسلمان کی نظر سوئے ہلائی عید ہے

شہر کے کچھ اہل زرائپنے مکانوں پر کھڑے
لے رہے ہیں چاند کی جلوہ نمائی کے مزے

اک طرف ایک آدمی بیٹھا ہے مر جھایا ہوا
وقت کا مارا ہوا قسمت کا ٹھکرایا ہوا

ہورہا ہے بے زری کے رنج سے اندوہ گیس
کل سوریے عید ہے اور جیب میں کچھ بھی نہیں

ایک بچی ناگہاں آکر یہ بولی پیار سے
چوڑیاں ابا میری لائے نہیں بازار سے

کہہ کر یہ ننگی کلائی پھر دیکھائی باپ کو
یاد کل کے پختہ وعدے کی دلائی باپ کو

سن کر یہ بچی کی باتیں ہو گیا چہرہ اداں
نبض ست پڑگئی کھلا گئے ہوش و حواس

چوت سی دل پر لگی جی رنج سے گھبرا گیا
 نا امیدی چھا گئی غم سے پیسہ آگیا
 کانپ اٹھا درد سے اس کا دل اندوہ گیں
 ڈبڈبا آئیں وفورِ رنج سے آنکھیں وہیں
 دیکھ کر بچی اُسے روتا ہوا رونے لگی
 آنسوؤں سے پھول سے رُخار کو دھونے لگی
 پونچھ کر دامن سے آنسو گود میں اُس کو لیا
 ہاتھ سر پر پھیر کر سینے سے پھر لپٹا لیا
 دیکھ کر یہ بے کسی سینوں میں دل دہلنے لگے
 فرطِ غم سے حوصلے سب خاک میں ملنے لگے
 اے ہلالِ عید ان کو کیا خوشی ہو عید کی
 ٹھوکروں میں پورش پائی ہو جن کی زندگی
 اے غریبو بے نواوَ اے رفیقو دوستو
 بے کسی میں مسکراوَ خستہ حالی میں ہنسو
 رحم دل اتنا نہیں ہے حکمرانِ روزگار
 چیردے جس کا کیجھ آنسوؤں کی تیز دھار

غزل

بے نیازی جنوں جس میں نمودار نہیں
ایسا سجدہ کبھی شایان دریار نہیں

اپنے ایماں سے میں خود بھی خبردار نہیں
کافر زلف نہیں رُخ کا پرستار نہیں

گرمیسر ہونگا ہوں کوشور جلوہ
پردہ راز کوئی مانع دیدار نہیں

دل وہ دل کب ہے جو مجروح غمِ عشق نہ ہو
سر وہ سر کب ہے جو الفت میں سردار نہ ہو

دیکھے آنکھوں سے جورنگ شکستِ عشرت
کوئی اس بزم میں اتنا بھی توہشیار نہیں

آئینہ میں ہے اک ایسی بھی تجلی اُمر
عالم ناز بھی خود جس سے خبردار نہیں



غزل

لطفِ نگاہِ ناز کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اتنے غمِ فراق میں سجدے کیے کہ اب
سر آستانِ یار کے قابل نہیں رہا

ڈوبا ہے بحرِ غم میں سفینہ کچھ اس طرح
دل میں ملالِ عشرتِ ساحل نہیں رہا

بڑھ کر نقابِ بن گیا دردِ فغانِ دل
جب ان کو ہوشِ پردہِ محمل نہیں رہا

آخر وہ راہِ عشق میں منزل نہ پاسکا
جس کو شعورِ جادہِ منزل نہیں رہا



غريب اور عوام سے

ان سے ملئے کہ بُرے حال ہیں برباد ہیں یہ
 میری دنیا میرے ماحول کے افراد ہیں یہ
 گرچہ دنیا کی نظر میں ہیں بدحال غریب
 چشم بینائے مشیت میں ہیں لیکن یہ حبیب
 ان میں مزدور بھی فنکار بھی دہقان بھی ہیں
 ان میں عیسائی بھی ہندو بھی مسلمان بھی ہیں
 ان کی آمد سے بڑھ کر کہیں صرف ہیں ان کے
 فیضِ تعلیم سے محروم ہیں پچھے ان کے
 پیٹ بھر کر انہیں ملتی نہیں کھانے کو غذا
 اور بیماری میں ملتی نہیں پینے کو دوا
 جان گھٹ گھٹ کے یونہی تن سے نکل جاتی ہے
 زندگی موت کی تلنگی سے بدل جاتی ہے

یہ ہری چیک کے موزے یہ سیاہ کاف کے بوٹ
یہ بلیو رنگ کی ساری یہ گرے سلک کا سوت

یہ چمکتی ہوئی کاریں یہ دکتے ہوئے ہار
یہ عمارت کی نمائش یہ تکلف کے شعار

یہ ہوا دار دریجے یہ فلک بوس مکان
یہ طرب خیز باغیچے یہ ہری گھاس کے لان

جلوہ فرما ہے ہر اک بزم انہیں کے دم سے
سارے ہنگامے ہیں سرگرم انہیں کے دم سے

اہل دولت کے دلوں میں ہے جوانی ان سے
یعنی لو ہے کی کلوں میں ہے روائی ان سے

یہ اگر چاہیں تو طوفان سے لڑ سکتے ہیں
موت کے پنجہ خونی سے اکٹھ سکتے ہیں

جو ش غیرت سے بھڑک جائے اگر ان کا دماغ
یہ بجھا سکتے ہیں تہذیب و تمدن کے چراغ

اہل دولت کو بھی محتاج یہ کر سکتے ہیں
 فرق شاہی کو بھی بے تاج یہ کر سکتے ہیں
 لیکن افسوس یہ بات نہیں جانتے یہ
 رنج اس کا ہے کہ خود نہیں پہنچاتے یہ
 میری محبوب ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو
 روپ اس دور کے انسان کا دکھاؤں تجھ کو



غزل

کس کے جلوؤں کا تصور ضو فشاں ہے سامنے
 کامیابی کارواں در کارواں ہے سامنے
 کیا کہوں آنکھوں کا کیا راز نہاں ہے سامنے
 کون مانے گا کہ وہ جلوہ کناں ہے سامنے
 ذرّہ ذرّہ وجد میں ہے جھوم اُٹھی ہے کائنات
 سازِ ہستی پر کوئی پھر نغمہ خواں ہے سامنے
 نرگس و شمشاد سے کچھ کم نہیں خارِ وطن
 دیکھنے والوں کا حسن گلستان ہے سامنے
 عقل والے ہیں تلاشِ راہ منزل میں ابھی
 گامزن اہل جنوں کا کارواں ہے سامنے
 دل بھی جھک جائے جہاں سجدے میں پیشانی کے ساتھ
 ہم نفس ایسا بھی کوئی آستان ہے سامنے
 خون اپنا بھی ہے اُمر صرف تزئین چمن
 داستان در داستان ہندوستان ہے سامنے



غزل

فتنه گلشن و آشوب نیتاں کوئی
میری فطرت کو موافق نہیں طوفاں کوئی

عشرت زیست اسے ہونہیں سکتی حاصل
جس کی آنکھوں میں نہیں اشک نمایاں کوئی

پوچھنے والا نہیں کوئی بھی پروانوں کا
بزم ہستی میں نہیں شمع فروزان کوئی

اپنی حالت پہ نہیں آئی ابھی نبضِ حیات
آنے والا ہے ابھی اور بھی طوفاں کوئی

ذوقِ نظارہ سلامت ہے تو انشاء اللہ
مل جائے گا کہیں بھی جلوہ تباہ کوئی

دلِ مضطرب کو ہے ہر حال میں تسلیم کی تلاش
کاشِ مل جائے کہیں درد کا درماں کوئی

یوں بھی آئی تھی کبھی میرے گلتاں میں بہار
کوئی دامن تھا سلامت نہ گریباں کوئی

خون کی چھینٹوں سے گلنگ ہے دامن بہار
اہل گلشن میں نہیں صاحب عرفان کوئی

ہرتباہی میں ہے مستور مرا افسانہ
میری بربادی کا احر نہیں عنوان کوئی



غزل

یہ حسین گلوں کی چھل پل یہ بہار کا زمانہ
 مجھے ڈر ہے مٹ جائے نہ یہ شاخ آشیانہ
 نہ یہ بت کدے کی چوکھٹ نہ حرم کا آستانہ
 مرے ذوق بندگی کا کہیں اور ہے ٹھکانہ
 ملے نقش پا جہاں تک دلِ ناتواں چلا چل
 ہے یہ منزلِ محبت نہیں اس کا کچھ ٹھکانہ
 تیرے در سے وہ مراتب میری بیخودی نے پائے
 کہ جہاں جبیں جھکائی وہیں جھک گیا زمانہ
 تیری شان بے نیازی میری ہم سفر ہے ورنہ
 یہ میری شکستہ کشتی اور یہ ہوا مخالفانہ
 یہ حرم ہے یا شوالہ مجھے اس سے کیا زاہد
 مرا کام ہے بندگی نہ شعورِ آستانہ
 میں ہوں عصرِ نو کا شاعر میری کئے نئی ہے احر
 ہے نئے ادب کا حامل میرا ذوقِ شاعرانہ



ہماری مطبوعات

- گلہائے محبت
- منتخب نعتیہ کلام
- جے پور کے اولیاء حصہ اول
- جے پور کے اولیاء حصہ دوم
- دیوانِ ناظمِ سنبھلی
- آپ کس حال میں ہیں؟
- جمعہ کی فضیلت
- حج کے پانچ دن
- بصیرت سے محروم دل
- شادی اور زندگی
- قیامت قریب آگئی
- انتخاب کلامِ ناظم
- انوارِ الجمال فی تذکرة الجمال
- قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں

ناشر

ایجنسی ہمدرد دو اخانہ، ۳۱۲، رام گنج بازار، جے پور

فون 2607012